سورج
کے
ساتھ
ساتھ
ڈاکٹر پرویز پروازی

# دریچہ

یہ سفر نامہ ہم نے قسطوں میں لکھا تھا حق تو یہ تھا کہ اس کا دیباچہ بھی قسطوں میں لکھتے مگر یک مُشت لکھنا پڑ رہا ہے اور وہ مُشت بھی مُشتے بعد از جنگ والی۔ اگر وہم و گمان میں بھی یہ بات ہوتی کہ یہ سفر نامہ کبھی کتابی صورت میں بھی شائع ہوگا تو جاپان سے واپس آنے سے پہلے اس کا دیباچہ بھی لکھ رکھتے کہ جاپان کے پتہ کے ساتھ شائع ہوتا تو زیادہ مستند سمجھا جاتا۔ مگر اب سوائے اس کے اَور کوئی چارہ نہیں کہ بر کلّۂ خود می زند کے مرتکب ہوں —— چنانچہ ہو رہے ہیں! اور برابر اسی سوچ میں ہیں کہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء تک کے سفر نامے پر ۱۹۸۰ء کے آخری مہینہ میں کمالیہ میں بیٹھ کر دیباچہ لکھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

جاپان اتنا خوب صورت مُلک ہے کہ اس کے بارہ میں بیگم اختر ریاض الدّین یا ابن انشا مرحوم جیسے ادیب ہی لکھتے ہوئے بھلے لگتے ہیں اور تھے! مگر جاپان



جانے کے بعد جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد، کے زیرِ اثر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم نے بھی خوب صورت جاپان کے بارہ میں یہ سفر نامہ لکھنے کی جسارت کر ڈالی ہے ورگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم!

جانے کو تو ہم چین بھی گئے ہیں، نہ صرف گئے ہیں بلکہ پیکنگ ایئرپورٹ کے باہر ماؤزے تنگ کے دیو قد مجسّمہ کے ساتھ تصویر بھی کھچوائی ہے، دوبئی ایئرپورٹ پر شیخوں کو شیخیاں بگھارتے بھی دیکھا ہے۔ فرینکفورٹ کے وسیع و عریض مطار کے ایک کیفے میں جرمن کافی بھی پی ہے، پیرس کے ایک سیکیورٹی والے کو جنرل ڈیگال سمجھ کر سیلیوٹ بھی کیا ہے مگر اس کے باوجود اُن ملکوں کا سفر نامہ لکھنے کی جرأت نہیں کی ہے کیونکہ کہتے ہیں زمانہ میں حیا بھی ہے کوئی چیز! لہٰذا ہمارے نزدیک اس سفر نامہ کی واحد خصوصیّت یہ ہے کہ یہ سفر نامہ جاپان میں رہ کر لکھا گیا ہے اور بس!!

جاپان کی صنعتی مصنوعات پاکستانی عوام کی زندگی میں اتنی دخیل ہو چکی ہیں کہ لوگ اس مُلک کے بارہ میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں مگر اس سفر نامہ میں شاید سب کچھ انہیں نہیں ملے گا کیونکہ ہم نے التزاماً کسی ایسی چیز کا ذکر نہیں کیا جس سے خود دوچار نہیں ہوئے اور یہ بُری عادت ہم نے جاپان میں رہ کر ہی اختیار کی ہے۔

ایک امریکی مصنّف نے اپنے جاپان کے سفر نامہ کو اس فقرہ سے شروع

کیا کہ جاپان کے ساتھ گیشا کا تصوّر لازم و ملزوم ہے لہٰذا جس سفرنامہ میں گیشا کا
ذکر نہیں وہ نامکمّل ہے۔ ہمارا سفرنامہ بھی اس امریکی معیار پر پُورا نہیں اُترتا۔
کیونکہ ہم چار سال میں ایک بار بھی کسی گیشا ہاؤس میں نہیں گئے۔ کیوں نہیں گئے؟
اس کی وجہ اسلامی ہرگز نہیں تھی صرف اقتصادی تھی کہ گیشا ہاؤس میں ایک گھنٹے
کی تفریح حاصل کرنے کے لئے ہماری سال بھر کی تنخواہ درکار تھی اس لئے ہم کیوتو
کے گیئون کے علاقہ میں ہمیشہ اُردو شاعری کے روائتی عاشقوں کی طرح جاتے
رہے کہ کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کے چلے گئے۔ ترے کُوچے میں اگر
آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے۔

ابن انشا مرحوم نے اپنے ایک سفرنامہ میں اپنے میزبان سے شکوہ کیا تھا
کہ وہ انہیں ایسے گیشا ہاؤس میں لے گئے "جہاں کی گیشائیں ریٹائرمنٹ کی عمر
کو پہنچی ہوئی تھیں"۔ مگر انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ گیشا تو ایک مقامِ بلند
ہے کہ کوئی خاتون چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے گیشا نہیں بن سکتی! ہم بھی یہی
سمجھتے تھے مگر اب اندازہ ہُوا ہے کہ کیمونو پہننے والی ہر جاپانی لڑکی گیشا نہیں ہوتی۔
اگر اس خاتون کا تعلق واقعی کسی گیشا ہاؤس سے ہے اور جوان ہے تو مائیکو ہوگی۔
ادھیڑ ہے تو گیشا ہوگی۔ اگر زیادہ ادھیڑ ہے تو محض ریٹائرڈ گیشا ہوگی! یہ
نسخہ اُردو کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہوگا ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ گیشا بننے
کے لئے بارہ سال کی عمر کی بچّیاں گیشا ہاؤس میں بھیجی جاتی تھیں۔ بارہ سال تک



انہیں تربیت دی جاتی تھی۔ ۲۵ سال کی عمر تک پہنچ کر مائیکو بنتی تھیں۔
پندرہ سال مائیکو کی حیثیت سے گزارنے کے بعد گیشا بنتی تھیں اس لئے
ظاہر ہے کہ اٹھائیس سال کی تربیت کا خرچ گاہک ادا نہیں کریں گے تو
اور کون کرے گا؟ لیجئے صاحب ہمارا سفرنامہ کم از کم امریکی معیار کے
لحاظ سے مکمّل سفرنامہ بن گیا ہے!

اس سفرنامہ میں ہم نے اس بات کا تذکرہ بھی نہیں کیا جاپان میں پروفیسر
کی کیا قدر و منزلت ہوتی ہے اور لوگ کس طرح ان لوگوں کی راہ میں آنکھیں
بچھاتے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کے ایک پُرانے ریٹائرڈ پروفیسر کو ایک بار
یونیورسٹی میں آنا تھا۔ ہفتہ بھر ہما ہمی کہ فلاں پروفیسر اتنے عرصہ کے بعد
یونیورسٹی میں آ رہے ہیں۔ صفائیاں ہو رہی ہیں، تذکرے ہو رہے ہیں،
لوگ باگ اپنے اپنے لباس پر خاص توجّہ دے رہے ہیں۔ گویا کوئی
ریٹائرڈ پروفیسر نہیں بادشاہ سلامت تشریف لانے والے ہیں۔ مگر یہاں
پہنچ کر یونیورسٹی میں پڑھاتے پڑھاتے سیدھے کمالیہ کے انٹرمیڈیٹ کالج
میں اٹکے ہیں تو چھٹی کا دودھ یاد آ رہا ہے۔ اس لئے جاپانیوں کی اُستاد نوازی
کا تذکرہ کرنے سے فائدہ؟

اس سفرنامہ میں ایک مقام پر ایک آدھ نرخ نامہ بھی موجود ہے ۱۹۸۰ء
میں اسے دس سے ضرب دے لیجئے ورنہ ہم ذمّہ دار نہیں ہوں گے۔

رسمی شکریہ کس کس کا ادا کریں؟ اتنے سارے لوگوں کے احسانات کا
پشتارہ ہماری گردن پر ہے کہ رسمی شکریہ اس بوجھ کو ہلکا نہیں کر سکتا۔
اگر یہ سفرنامہ پڑھنے کے بعد آپ نے جاپان کے لئے رختِ سفر باندھ لیا
ہے تو آپ واقعی صاحبِ ذوق ہیں اور اگر کھول دیا ہے تو اس سے بھی زیادہ
ذوقِ نظر کا مظاہرہ کیا ہے۔ اللہ آپ کے ساتھ ہو۔

والسلام

(ڈاکٹر) پرویز پروازی
گورنمنٹ پی ایس ٹی انٹرمیڈیٹ کالج
کمالیہ
ضلع فیصل آباد

۱۱ر دسمبر ۱۹۸۰ء



## ۱

اوساکا جانے کے لئے ربوہ سے روانہ ہوئے تو عجیب و غریب کیفیت
تھی۔ ذرّہ ذرّہ سے لپٹ لپٹ کر ملنے کو جی چاہتا تھا — گاڑی روانہ ہوئی
تو آنکھیں چھلک آئیں لیکن بچوں کو ڈھارس دینے کے خیال سے آنسو پی لئے۔
جیسے جیسے گاڑی ربوہ سے دُور ہوتی گئی دل ڈوبتا گیا ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

لاہور سے پی آئی اے کے ذریعہ کراچی تک گئے — لاہور ائیرپورٹ پر
بہت سے دوست احباب اور اعزّہ چھوڑنے آئے تھے اُن سے مل کر روانگی
کے لاؤنج کی جانب چلے تو دل دھک دھک کر رہا تھا۔

چونکہ جہاز میں سفر کرنے کا پہلا موقع تھا اس لیئے سَو سَو اندیشے دل میں تھے۔ لاؤنج سے جہاز کی جانب چلے تو پھر وہی دوست اعزّہ کے چہرے سامنے تھے۔ سب ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ دِل اُمڈا آتا تھا لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ؎

ہم نے تھاما تھا سَیلِ گریہ کو ؛ ورنہ یادل اُمڈ کے آیا تھا

جہاز پر سوار ہوئے۔ اندر پہنچے تو ایک نیا جہان آباد تھا۔ بچّے جہاز پر سوار ہونے کی خوشی میں بہت خوش تھے۔ فرسٹ کلاس تقریباً خالی تھا۔ صرف دو مسافر پہلے سے موجود تھے۔ ہماری سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ دو ایک طرف اور دو دوسری طرف اور ایک پیچھے۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک صاحب بڑے انہماک سے اخبار پڑھ رہے تھے۔ جہاز کا دروازہ بند ہُوا —— انجن چلے اور پھر جہاز رینگنے لگا۔ تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی لیکن جب جہاز فضا میں بلند ہُوا تو ہم نے تفنّنِ طبع کے طور پر اپنے آپ سے کہا —— "لو میاں پرواز ی! آج پرواز کر کے دیکھ لو"۔ اِس پر خود ہی کھسیانی سی ہنسی ہنس کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ بچّے کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہے تھے اور بیگم چھوٹی بچّی کو سینے سے لگائے غالباً آیۃ الکرسی پڑھ رہی تھیں۔ جب جہاز اُوپر پہنچ کر سیدھا ہُوا تو چائے پانی کا دَور چلنے لگا۔ پہلے تو ایئر ہوسٹس نے چھوٹے چھوٹے گیلے تولیئے دیئے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اِن کا کیا کیا جائے۔ کَن انکھیوں سے اپنے



ساتھی کی طرف دیکھا وہ اُن سے ہاتھ صاف کرنے لگے۔ ہم نے بھی ہاتھ صاف کیئے اور بچّوں کو خالص پدرانہ اور ماہرانہ انداز میں ان تولیوں کی ترکیبِ استعمال بتائی ع

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

چائے آئی، پھل آیا اور پتہ نہیں کیا کیا اَلا بَلا لائی گئی لیکن ہم نے صرف چائے پر اکتفا کی جس کا ہمارے ساتھی پر بڑا خوشگوار اثر ہُوا کیونکہ وہ حضرت بھی ہر چیز کے بارہ میں "نہیں نہیں" کہتے کہتے چائے کے نام پر ریشہ خطمی ہو گئے تھے۔ تعارف ہُوا تو معلوم ہُوا کہ پی آئی اے کے پائلٹ ہیں اور اِس وقت کسی نجی کام سے کراچی جا رہے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ پی آئی اے کا جو جہاز ٹوکیو جاتا ہے وہ آپ ہی اُڑاتے ہیں —— وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے بھی رسماً اپنا تعارف کروایا اور ایک دو شناسا پائلٹ حضرات کا حوالہ دیا تو وہ اَور کھُل گئے۔ ابھی ہم تعارف کی اِسی منزل میں تھے کہ اعلان ہُوا "ہم تھوڑی دیر میں کراچی کے ہوائی اڈہ پر اُترنے والے ہیں اِس لئے حفاظتی بند (بیلٹ) باندھ لیجئے —— !"

جہاز اُترنے لگا۔ جیسے جیسے جہاز نیچے کی طرف آتا گیا کانوں کے پردے بند ہوتے چلے گئے۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ جب کان کھُلے تو معلوم ہُوا کہ جہاز لینڈ کر چکا ہے اور رَن وے پر بھاگ رہا ہے۔ آنکھیں کھُل گئیں کہ جہاز اتنی صفائی

سے اُتر جاتا ہے۔ پائلٹ کو داد دینے کو جی چاہا۔ جب سیڑھی لگانے لگے تو سیڑھی نے اگلے دروازے پر لگنے سے انکار کر دیا۔ کوئی میکانکی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اُدھر سب لوگ اُتر چکے تھے ہم فرسٹ کلاس والے کھلے دروازہ میں کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے کہ کب سیڑھی لگے اور کب نیچے اُتریں۔ اتنے میں پائلٹ کے کیبن کا دروازہ کھُلا اور ایک دڑھیل فرنگی چہرہ نمودار ہوُا اور سٹیورڈ سے گویا ہوُا کہ اِن مسافروں کو پچھلے دروازے سے نیچے اُتار دو کیونکہ جہاز لیٹ ہو جائے گا۔ مجھے ابھی واپس جانا ہے" ــــ مَیں نے اپنے ساتھی کیپٹن سے پوچھا "کیا پی آئی اے میں بھی غیر مُلکی پائلٹ ہیں؟" جھینپ کر کہنے لگے "صرف پائلٹ؟ جناب جس جہاز میں آپ نے سفر کیا ہے یہ جہاز کا جہاز ایک غیر ملکی فضائی کمپنی کا ہے جو پی آئی اے نے کرایہ پر لے رکھا ہے ــــ"

"اور جو جہاز آپ اُڑاتے ہیں وہ ......؟" چمک کر بولے "وہ اپنا ہی ہے!"

ــــ ہم پچھلے دروازے سے نیچے اُترنے لگے۔

نیچے اُترے۔ سامان سمیٹا۔ بچّوں کو ایک بنچ پر بٹھایا۔ برادرم عزیزم مختار کو جو ہمیں لینے آئے تھے اُن کے پاس چھوڑا اور خود جاپان ایئر لائنز والوں کے کاؤنٹر پر پہنچے کہ اُن سے اپنا ٹھکانہ معلوم کریں لیکن وہاں تالہ پڑا ہوُا تھا۔ پی آئی اے والوں سے پُوچھا تو جواب ملا کہ "ہم صرف کراچی تک لانے کے ذمّہ دار ہیں آگے آپ جانیں اور وہ" ــــ البتہ ہم ٹیلیفون کر کے معلوم کئے دیتے ہیں۔



شاید انہوں نے کوئی بندوبست کر رکھا ہو" ٹیلیفون پر جواب آیا ــــ "بندوبست تو ہوٹل INN میں ہے وہاں بھیج دیجئے لیکن جو آدمی ان کا انتظام کرنے پر مامور تھا وہ آج چھٹی پر ہے اِس لئے ہم مزید کچھ عرض کرنے سے قاصر ہیں"۔

"INN" پہنچے۔ انتظام تو تھا لیکن کھانے وغیرہ کے کوپن نہیں آئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ایئر لائن والے یہ کوپن نہیں بھیجیں گے تو ہمیں اپنی جیب سے خرچ کرنا ہو گا۔ خیر ــــ کمروں میں پہنچے۔ ایر کنڈیشنر چلایا۔ بَیرے کو بُلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔ کھانا منگایا تو ساتھ ہی بل آیا۔ پچیس روپے فی کس کے حساب سے کوئی ڈیڑھ سَو روپے کا بل تھا۔ ہاتھوں کے طوطے اور چہروں کے رنگ اُڑ گئے۔ بَیرے نے ہماری یہ حالت دیکھ کر از راہ مہربانی فرمایا کہ صرف دستخط کر دیجئے۔ ایئر لائنز کی طرف سے کوپن آ گئے ہیں ــــ ہم جو بل کی جھلک دیکھ کر بے ہوش ہونے کی سوچ رہے تھے ہوش میں آ گئے اور کھانے پر پل پڑے۔ لیکن کھانا اتنا بدمزہ تھا کہ خاک لطف نہ آیا۔ خیال تھا کہ ایئر لائن والوں کی کوتاہی پر انتقاماً بہت کھائیں گے ــــ لیکن ع

اے رُوسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

حواس بجا ہوئے تو حبیب کو ٹیلیفون کیا۔ حبیب یعنی حبیب اللہ بٹ، جن سے پُرانی یاد اللہ ہے لیکن ابھی تک اُن کو خدمت کا موقع نہیں دیا تھا (یہ اُن کی کسرِ نفسی کے طور پر لکھ رہا ہوں) وہ پانچ بجے شام کار لے کر آ گئے اور آٹھ نو بجے

تک بچوّں کی سَیر کے اُوٹ پٹانگ تقاضے پُورے کرتے رہے۔ ایک جگہ بیگم کو
کچھ شاپنگ کی سُوجھی۔ بٹ صاحب نے ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور کے سامنے اُتار دیا
کہ یہاں سے جو کچھ لینا ہے لے لیجیے، مَیں سامنے کی سڑک پر کار پارک کرتا ہوں۔
کیونکہ یہاں بیچ سڑک کار کھڑی کرنا جُرم ہے۔ اُتر گئے۔ جلدی جلدی شاپنگ سے
فارغ ہوئے، واپس آکر بٹ صاحب کی کار ایک سڑک پر دیکھی، ندارد۔ دوسری
پر ندارد۔ تیسری پر ندارد — مایوس ہو کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے اور ہر آنے
جانے والی کار کو گھُورتے رہے ع

توچہ دانی کہ دریں گرد "حبیبے" باشد

آدھ گھنٹہ، پون گھنٹہ، ایک گھنٹہ، سوا گھنٹہ تک آکر ٹیکسی لینے کی سوچی۔ شام
کا جھٹپٹا، انسانوں کی ریل پیل، دھکّم دھکّا۔ کاریں بہت لیکن ٹیکسی کوئی نہیں تھی ع

زمیں سخت تھی آسماں دُور تھا

بیگم سراسیمہ، بچے حیران اور ہم خاموش — ع

جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

دُور سے دیکھا تو حبیب اللہ بٹ سامنے کی سڑک پر کھڑے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر
ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جان میں جان آئی، لپک کر پہنچے — "بھائی
آپ کہاں تھے؟ ہم تو تلاش کرتے کرتے ہلکان ہو گئے" — "اور آپ کہاں تھے؟"
— "ہم تو یہیں تھے!" — "اور مَیں بھی یہیں تھا اسی سامنے کی سڑک پر!



"ہم نے تو سب سڑکیں دیکھ ڈالیں بس سامنے کی سڑک پر غور سے نہیں دیکھا"
— "اور مَیں بھی آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گیا!" — رشید قیصرانی
یاد آگیا ؎

اِک عمر جستجو میں گزاری تو یہ کھُلا
وہ میرے پاس تھا مَیں جسے ڈھونڈتا رہا

واپس ہوٹل آئے۔ بٹ صاحب کو رخصت کیا۔ سونے کی تیاری ہونے
لگی لیکن نیند کو آنا تھا نہ آئی۔ اِن اونچے ہوٹلوں میں اتنا آرام ملتا ہے کہ نیند اُڑ
جاتی ہے۔ ہم نے سوچا کہاں آن پھنسے۔ مومنؔ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہُوا تھا ؎

شب جو مسجد میں جا پھنسے مومنؔ
رات کاٹی خدا خدا کر کے

صبح چار بجے کی فلائٹ پر روانگی تھی۔ ڈھائی بجے ایرلائن کی گاڑی
لینے آگئی۔ بوریا بستر سمیٹ کر سوار ہوئے اور چل تو جلال تو پڑھتے ہوئے
انٹرنیشنل رُوٹ کے کسٹم والوں سے بھڑنے کے لیے تیار ہونے لگے۔ ٹکٹ
چیک ہوئے، سامان بُک ہُوا۔ ٹیکوں کے سرٹیفکیٹ دکھائے گئے۔ آخر پاسپورٹ،
ویزا اور دیگر کاغذات کی چیکنگ کے کاؤنٹر پر پہنچے۔ دِل دھل دھل کر رہا تھا
کہ خدایا! اگر ان لوگوں نے مین میکھ نکال کر ہمارا جانا روک دیا تو کیا بنے گا؟
— لیکن اِس کاؤنٹر پر دو نہایت ہی شریف قسم کے امیگریشن پولیس والے

بیٹھے تھے۔ پاسپورٹ دیکھے، ویزے اور دیگر کاغذات چیک کئے اور ہمیں جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہم نے سوچا جان بچی سو لاکھوں پائے لپک کر روانگی کے لاؤنج میں پہنچ گئے۔

اعلان ہوا کہ جاپان ایئرلائنز کا جہاز آدھ گھنٹہ دیر سے آئے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ابھی مزید ایک گھنٹہ لاؤنج میں ٹھہرنا پڑے گا۔ بچوں کو نیند آرہی تھی اور ہم خود بھی رت جگے کے باعث اونگھ اور نیند کے مابین کسی مقام پر معلق تھے لیکن لاؤنج بہرحال لاؤنج تھا جو باہر کے مختلف روٹوں پر جانے والے مسافروں سے اٹا پڑا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر احمد دین آگئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی جاپان جارہے تھے اور ہمارے ساتھ بنکاک تک سفر کرنے کے بعد وہاں سے سیدھے ٹوکیو جانے والے تھے، اُن سے گپ شپ ہوتی رہی۔ ساتھ کے صوفے پر بیگم گُم سُم بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن کے قہقہے کی آواز گونجی، مُڑ کر دیکھا تو دو خواتین کے ساتھ خوب محو ہو کر گفتگو کر رہی تھیں۔ وہ خواتین مارشیس کی تھیں اور بمبئی تک کی رفیقِ سفر بننے والی تھیں۔ جُوں توں یہ وقت گزرا۔ جہاز کی آمد کا اعلان ہوا اور پھر مسافروں کو بُلوا آیا۔ ہم بس میں بٹھائے اور جہاز کے قریب اُتارے گئے۔ جہاز میں سوار ہوئے تو جاپانی فضائی میزبان خواتین نے عجیب و غریب زبان میں اھلاً وسھلاً کہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انگریزی میں استقبالیہ فقرے دوہرا رہی تھیں جو ہماری کم فہمی کے باعث ہمیں سمجھ نہیں



آرہے تھے۔ فرسٹ کلاس میں ہماری پانچ سیٹوں کے علاوہ باقی تمام سیٹیں پُر تھیں اور مسافر خرّاٹے لے رہے تھے۔ میرے ساتھ کی نشست پر ایک صاحب دراز تھے اور عظیم الشان "خرّاٹہ نواز" واقع ہوئے تھے۔ ("طبلہ نواز" کے وزن پر "خرّاٹہ نواز" ہماری اختراع ہے ع گر قبول اُفتد!)

جہاز روانہ ہوا تو ہم بھی سونے کا سوچنے لگے اور کچھ دیر کے لئے شاید سو بھی گئے کیونکہ جب بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اُترنے کا اعلان ہوا تو ہم چونکے تھے اور ہڑبڑا کر پیٹی باندھنے لگے تھے جو پہلے ہی بندھی ہوئی تھی۔ بچّے خوب مزے سے سو رہے تھے۔ بیگم بھی چھوٹی بچّی کو پالنے میں لٹا کر چین سے سو رہی تھیں۔ ہمارے سامنے کافی کی پیالی اُسی طرح لبالب پڑی تھی جو ہم نے غالباً سونے سے پیشتر ایئرہوسٹس سے منگوائی تھی اور پینے سے پیشتر سو گئے تھے۔ جلدی سے پیالی کو مُنہ لگایا اور بڑا سا گھونٹ بھر لیا لیکن کافی اتنی گرم تھی کہ لبوں سے معدہ تک ہر چیز کو جُھلستی چلی گئی۔ اِس پر یہ عقدہ کُھلا کہ ہم بہت ہی تھوڑی دیر کے لئے سوئے تھے، اتنی تھوڑی دیر کے لئے کہ کافی ابھی گرم تھی اور پیٹی ابھی بندھی ہوئی تھی۔

جہاز بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اُترنے والا تھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا، دھوپ خوب چمک رہی تھی اور نیچے شہر میں کچھ بَونے سے چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ جہاز ذرا نیچے ہوا تو انسانی ہیولے صاف دکھائی دینے لگے۔ ہوائی اڈہ پر جہاز رُکا تو بہت سے مسافر اُتر گئے۔ ہمارا کیبن بھی تقریباً خالی ہو گیا۔ ہم نے پوچھا "کیا باہر

جانے کی اجازت ہے ؟" معلوم ہوا سب لوگ اُتر کر لاؤنج تک جا سکتے
ہیں لیکن پاکستانی شہری نہیں اُتر سکتے ۔

بمبئی سے ایک دو مسافر سوار ہوئے اور جہاز بنکاک کی طرف محوِ پرواز
ہوا۔ کچھ دیر تک تو ہندوستان کی زمین نظر آتی رہی اس کے بعد سمندر شروع
ہو گیا۔ جب جہاز والوں نے خلیج بنگال کا نام لیا تو ہمیں مشرقی پاکستان بہت
یاد آیا۔ ؏ اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے ——

ہم ہائے ہائے کر رہے تھے کہ ناشتہ کے لئے میز لگائی گئی۔ پہلے کچھ
چھری، کانٹے، نیپکن، چمچے اور پیالیاں آئیں۔ پھر قسط وار ناشتہ آنے لگا ؏
خُم آئے گا۔ صراحی آئیگی پھر جام آئیگا

ناشتہ کچھ کچھ تو اپنے روایتی ناشتہ کی طرح تھا یعنی توس، انڈے،
مکھن، پنیر وغیرہ اور کچھ وغیرہ وغیرہ تھا جو سمجھ سے بالا تھا۔ ایئر ہوسٹس سے
پوچھا "یہ کیا ہے ؟" —— جواب ملا۔ "ناشتہ" —— ہم نے پوچھا —— "سُؤر
وغیرہ کا گوشت تو نہیں ؟" —— فرمایا۔ "نہیں، یہ مسلمان ناشتہ ہے" ——
گویا ناشتہ بھی مسلمان نکلا۔ الحمد للہ ! بسم اللہ پڑھی اور ڈٹ گئے۔ میز
صاف ہو گئی۔ "کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ"۔ جب سیر ہو گئے تو نیند نے زور پکڑا۔
—— جاگے تو تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک کے قریب تھے۔ تھوڑی دیر
میں بنکاک کے ہوائی اڈے پر اُترے۔ ڈاکٹر احمد دین کو الوداع کہا اور سامان



لے کر بال بچوں سمیت لاؤنج جانے کے لئے بس میں سوار ہو گئے۔ بس
میں تین چار مانوس سی خواتین دکھائی دیں۔ ابھی ذہن کو ٹٹولنے کی کوشش
کر رہے تھے کہ ایک ہماری بیگم کے بالکل پاس آ گئیں اور ہماری ننھی منّی بچی
سعدیہ کو پیار کرنے لگیں —— معلوم ہوا کہ وہ فضائی میزبان خواتین ہیں۔ جو
ہمارے ساتھ کراچی سے آئی ہیں اور اب ایک دن یہاں چھٹی گزاریں گی
اور اگلے روز ہمارے ساتھ جاپان جائیں گی۔

بنکاک کے ہوائی اڈہ پر استقبال بڑا خوشگوار تھا۔ بس معمولی سی
چیکنگ ہوئی، سامان لیا، موٹر میں بیٹھے اور بنکاک کے سب سے بڑے
ہوٹل مانٹین (MONIEN) پہنچ گئے۔

ہوٹل کیا تھا عجائب خانہ تھا۔ صاف شفاف چکنے فرش۔ شیشے کے
دروازے۔ ہم سیدھے ریسپشن کی طرف بڑھے تو شیشے سے ٹکرا گئے۔
معلوم ہوا رستہ کسی اَور طرف ہے۔ موٹر والے سے سامان وغیرہ لیا
اور مُڑ کر آنے کو تھے کہ وہ لپک کر سامنے آ گیا کہ ٹپ دیجئے —— ہم نے
کہا "ٹپ کس بات کی ؟ جاپان ایئر لائن والوں سے لو —" تنک کر بولا "جی
میں ایئر لائن والوں کو نہیں آپ کو لایا ہوں"۔ بمشکل ایک ڈالر دے کر جان
چھڑائی —— ریسپشن والوں نے بتایا کہ "آپ کے لئے کمرہ نمبر ۲۳۰ اور
۲۳۱ ریزرو ہیں یہ لیجئے چابیاں اور سیدھا ریے دوسری منزل پر ——"

لفٹ کے بارہ میں پُوچھا تو مسکرا کر کہا "یہاں لفٹ نہیں ہوتی"۔
ویٹر سامان لے کر جا رہا تھا اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر ہمیں جھڑکا کہ "میرے پیچھے نہ آئیے، ایلیویٹر (ELEVATOR) پر جائیے"۔ معلوم ہوا امریکہ کی طرح یہاں بھی لِفٹ کو لفٹ نہیں ایلیویٹر کہتے ہیں۔
دوسری منزل پر پہنچے تو سامان والا بتیسی نکالے سامنے کھڑا تھا۔ کمرے میں گئے۔ داخل ہوئے تو یوں محسوس ہوا کسی اَور کے کمرہ میں آ گئے ہیں نفیس باریک پردے، دو دو انچ دبیز قالین۔ پلنگ پر بیٹھے تو بیٹھتے چلے گئے۔
اِدھر اُدھر نظر دَوڑائی تو سامنے کونے میں ریفریجریٹر پڑا تھا۔ بچّوں نے کھول کر دیکھا تو کوکا کولا، فانٹا اور سیون اَپ سے بھرا پڑا تھا۔ یہ حضرات ٹُوٹ پڑے اور تین تین چار چار بوتلیں چڑھا گئے۔ کونے کی میز پر شراب کی بوتلیں اور تَلی ہوئی مونگ پھلی پڑی تھی۔ یعنی ہر ضروری آسائش مہیّا تھی کہ مسافروں کو منگوانے اور انتظار کی زحمت سے بچایا جائے۔ سو بچّوں نے مونگ پھلی کو بھی "کیفرِ کردار" تک پہنچایا اور کھانے کا انتظار کرنے لگے۔
کھانا منگوانے کے لئے بَیرے کو طلب کیا تو اُس نے کونے میں رکھی ہوئی ایک موٹی سی کاپی بڑے احترام سے اُٹھا کر پیش کی کہ "مینو ملاحظہ فرمائیے!"
—— اب جو پڑھنے بیٹھے تو سٹی گُم ہو گئی۔ کھانوں کے ایسے ایسے جنّاتی نام لکھے ہوئے تھے کہ کچھ پلّے نہ پڑتا تھا۔ آخر اپنی دانست میں ایک مناسب سا



کھانا چُن لیا اور آرڈر دیا۔ نام تھا "INDONESIAN FRIED RICE"۔
تھوڑی دیر میں کھانا آیا اور بَیرے نے آدھ گھنٹہ میں اسے میز پر سلیقہ سے سجایا۔ جب میز سج چکی تو خالص فوجیوں کے انداز میں سیلیوٹ مار کر کہا "تناول فرمائیے!" ہم سب میز پر پہنچے۔ ایک ڈِش اوندھا رکھا تھا اُسے اُٹھایا تو چاول نظر آئے لیکن اتنے موٹے موٹے اور تنے ہوئے، لگتا تھا ابھی خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اُترے ہیں۔ چکھے تو عجیب بساندسی آئی۔ دوسری ڈِش دیکھی انڈے سے تھے لیکن خدا معلوم کِس چیز کے؟ کہ انڈے تھے بھی اور نہیں بھی ع
ہر چند کہیں ہے کہ نہیں ہے۔
تیسری پلیٹ دیکھی تو معمّہ تھا، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ چوتھی کے لئے مضمون واحد تھا۔ غرض سارے کا سارا کھانا ایسا تھا کہ فقط کھایا نہ جا سکا۔ بچّوں نے ایک ایک دو دو نوالے لئے اور ہاتھ کھینچ لیا۔ بیگم تو ناک پر رومال رکھ کر محض دیکھنے کی گنہگار ہوئیں اور صرف کوکا کولا پی کر ایک طرف ہو بیٹھیں۔ ہم نے بھی کچھ ایسا ہی کیا۔ ۲۵۰ روپے کے بِل پر دستخط کئے اور پیٹ پر پتھر باندھ کر چائے کا آرڈر دے دیا۔ جب بَیرا چلا گیا تو مینو کی کتابِ مقدس دوبارہ کھنگالنا شروع کی اور آخر MIDNIGHT SNACKS کے کالم میں سے سینڈوچ کو ڈھونڈ نکالا اور چائے کے ساتھ منگوائے۔ حق یہ ہے کہ سینڈوچ بہت مزیدار تھے۔ یہ بھی حق ہے کہ بھُوک میں کچھ زیادہ ہی چمکی ہوئی تھی۔

شام کو ہوٹل والوں سے ٹیکسی کرائے پر لی اور بنکاک کی سیر کرنے کی ٹھانی۔ ٹیکسی میں بیٹھنے لگے تو ڈرائیور نے مؤدّب ہو کر پوچھا "کہاں سے آئے ہیں؟" بتایا ــــ "پاکستان سے" ــــ چہک کر بولا "مسلمان ــــ ؟" عرض کیا "جی ہاں! بحمداللہ مسلمان ــــ!" فوراً مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا کر بولا ــــ "السّلام علیکم۔ مَیں بھی مسلمان ہوں، میرا نام محمدؐ ہے ــــ محمدؐ نے ہمیں تین گھنٹے تک بنکاک کی سیر کرائی۔ بنکاک کیا ہے نرا امریکہ ہے جس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مثلاً ایک، دو، تین، چار۔ کون کون سی بیان کروں؟

بنکاک میں پھلوں کی دکان پر گئے، یہ لمبے لمبے کیلے اور لحیم و شحیم۔ درجن بھر لے لئے لیکن اگلے روز رات تک ہم سے ختم نہ ہو سکے جہاز سے اُترتے وقت کُوڑے کی ٹوکری میں پھینکنا پڑے کہ گل گئے تھے۔ بچّوں نے دو کھائے اور سیر ہو گئے۔ رات کو کھانے کا پوچھا تو جواب ملا "بھُوک نہیں"۔ گویا دوپہر اور رات دونوں کے کھانے کی کسر نکل گئی۔

بیگم نے ایک بیگ خریدا۔ لاہور میں اِس لئے نہ خریدا تھا کہ پچاس روپے میں ملتا تھا اور بہت مہنگا لگتا تھا۔ بنکاک میں اس قسم کا بیگ ۲۵۰ روپے میں خریدا۔ وطن کی یاد بھی آئی اور قدر بھی معلوم ہوئی۔ ایک بیلٹ کہ لاہور میں پینتیس روپے میں ملتی تھی مہنگی سمجھ کر چھوڑ دی لیکن بنکاک میں ۸۵ روپے میں خریدنا پڑی۔ مجبوری تھی کہ پتلون سینے والے نے بیلٹ باندھنے کی شرط باندھ کر پتلون سی تھی اور بیلٹ کے بغیر پتلون پہنی نہ جا سکتی تھی ورنہ اکبر الٰہ آبادی والا مضمون پیدا ہونے کا اندیشہ تھا کہ ؎

یہ جامے سے باہر ہیں وہ پاجامے سے باہر ہیں

واپس ہوٹل میں آئے۔ ٹیکسی کا بل مانگا تین سَو روپے کا بل آیا۔ اَور کرو بنکاک کی سیر۔

صبح پانچ بجے ہوٹل والوں نے آ جگایا کہ جہاز سات بجے روانہ ہوتا ہے، جلدی کیجئے! بچّوں کو تیار کرتے کرتے سوا چھ ہو گئے۔ ہوائی اڈّہ ہوٹل سے بیس میل دُور تھا اور اس موٹر میں ہمارے علاوہ دو اَور مسافروں کو بھی جانا تھا جو ساڑھے پانچ بجے سے موٹر میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ خفّت اور معذرت کے ساتھ موٹر میں سوار ہوئے۔ اب ڈرائیور صاحب نے ہَوا سے شرط باندھی۔ سپیڈو میٹر کی سُوئی کبھی سَو کے اِس طرف کبھی اُس طرف۔ سڑک پر ٹریفک بے شمار۔ دِل دھڑکنے لگا۔ خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی لیکن بول بھی نہیں سکتے کہ قصور اپنا تھا۔ جلدی تیار ہو گئے ہوتے تاکہ وقت پر ہوائی اڈّہ پر پہنچتے۔ خدا خدا کر کے ہوائی اڈّہ پہنچے تو جان میں جان آئی۔ ٹکٹ چیک ہُوا، سامان چَیک ہُوا اور پھر ہم چَیک ہوئے۔ بس میں بٹھائے گئے اور جہاز میں لا کر سوار کرا دیئے گئے۔ ہمارے سوار ہونے کی دیر تھی کہ جہاز نے اُڑنے کے لئے پَر تولے۔ بنکاک سے منیلا تک کا سفر خاصا تکلیف دہ سفر

تھا۔ تکلیف دہ اس معنیٰ میں کہ سمندر کے اوپر ہی اوپر پینتیس ہزار فٹ کی
بلندی پر اُڑتے ہوئے جہاز یک دم غوطہ کھاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے AIR-GAP
آگیا ہے گویا جہاز اُڑتا نہیں اُچھلتا کودتا ہے ؎

چلا جاتا ہوں اُچھلتا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

بنکاک سے جہاز روانہ ہوا تو موسم خاصا خوشگوار تھا، دھوپ
نکلی ہوئی تھی لیکن ہوا میں نمی تھی۔ جہاز فضا میں پہنچ گیا تو ہم نے حفاظتی بیلٹ
کھولی اور اطمینان سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ ابھی بمشکل دو منٹ گزرے
ہوں گے کہ اعلان ہوا حفاظتی بیلٹ باندھ لیجئے کیونکہ موسم خراب ہو گیا ہے
اور جہاز کے زیادہ ہچکولے کھانے کا ڈر ہے۔ پھر کمر باندھ لی۔ اس دوران
ناشتے کی سواری آگئی۔ پوچھا گیا کیا پئیں گے؟ عرض کیا چائے یا کافی، ہوسٹس
نے پریشان ہو کر پوچھا "بس"؟ ہم نے مسکرا کر کہا "جی ہاں! بس! وہ شریف
خاتون یہ سوچتی ہو گی کہ جب وافر مقدار میں بیئر اور وسکی مفت مل سکتی ہے
یہ عجیب آدمی ہے جو محض چائے اور کافی پر قناعت کر رہا ہے ؏

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ناشتہ بھی غیر شریفانہ حد تک طولانی تھا لیکن ہم نے بھی خوب جی کھول کر
دادِ شجاعت دی اس لئے کہ قسطوں میں آنے کی وجہ سے دوسری قسط آتے آتے



پہلی قسط کا صفایا ہو جاتا تھا۔ لہٰذا ہوسٹس لاتی چلی گئی اور ہم کھاتے چلے گئے۔
جب فارغ ہوئے تو سامنے خالی پلیٹوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے
تھے ؎

مے مری توبہ شکن۔ توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ ادھر چھری کانٹے سے کسی منہ زور چیز کو رام کر کے
منہ میں ڈالنے کے لئے اُٹھایا اُدھر جہاز نے غوطہ لگایا۔ کانٹا ناک پر اور چھری
گردن پر آگئی اور ——— "چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی"

ہمارے کیبن میں ہمارے علاوہ صرف ایک مسافر اور تھا نہایت مسکین
اور شریف۔ اس لئے کہ ان کی سوئی "جی ہاں" پر اٹکی ہوئی تھی۔ ہوسٹس نے پوچھا
"بیئر لاؤں؟" فرمایا "جی ہاں" ——— "یا وسکی؟" ——— "جی ہاں!" ——— "ناشتہ
میں کیا پسند کریں گے؟" ——— "جی ہاں!" ——— ہوسٹس نے پریشان ہو کر ادھر
اُدھر دیکھا اور پھر نہایت ادب سے سرگوشی میں کوئی سوال کیا۔ بڑے میاں نے
ٹھنک کر جواب دیا "جی ہاں ———!"

ہوسٹس واپس ہوئی۔ اس اللہ کی بندی نے سب کچھ حاضر کر دیا اور وہ
حضرت قول کے ایسے پکے نکلے کہ سب کچھ صاف کر گئے۔ عوض معاوضہ گلہ
ندارد ———

ناشتہ سے فارغ ہوئے تو جہاز سے باہر جھانک کر دیکھا۔ نیچے گہرا نیلا سمندر تھا اور بادلوں کے دَل کے دَل تیرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک دو بحری جہاز بھی نظر آئے، یوں جیسے کھلونے ہوں۔ تھوڑی دیر میں اعلان ہوا کہ ہم فلپائن کے دارالحکومت منیلا میں اُترنے والے ہیں۔ اِس وقت منیلا میں بارش ہو رہی ہے اور درجۂ حرارت ۷۰ ڈگری ہے وغیرہ وغیرہ۔ جزائر فلپائن نگاہ میں تھے، چھوٹے چھوٹے اور بہت سے۔ جہاز اُوپر سے گزرتا رہا۔ حتّٰی کہ منیلا شروع ہوا ـــــ ایسا شروع ہوا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ خدا خدا کر کے کہیں جہاز نے نیچے کا رُخ کیا اور زَن سے منیلا ایئرپورٹ پر اُتر گیا۔ وسیع و عریض ایئرپورٹ ہے۔ جہاز کا تو اعلان کیا گیا کہ سب مسافر اُتر جائیں اور ایک گھنٹہ کے لئے لاؤنج میں آرام کریں کیونکہ جہاز کی صفائی ہوگی۔ اُترے ـــــ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی ـــــ لیکن دُھوپ بھی برابر نکلی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں گئے۔ لاؤنج کیا ہے پُورا دبستان ہے۔ سٹال ہی سٹال، جو جی میں آئے خریدیئے! ڈالر میں قیمت ادا کیجئے۔ ڈالر نہیں تو ٹریولر چیک دے دیجئے! بچّے کہاں چُوکنے والے تھے، آئس کریم کا سٹال ڈھونڈ نکالا اور آئس کریم اُڑائی۔ ایک سٹال سے بیگم نے تنکوں کا بُنا ہوا تھیلا خریدا۔ ایک دو مناظر کے کارڈ خریدے۔ اِدھر اُدھر پھرے اور ایک گھنٹہ کے بعد واپس جہاز میں !! لیجئے منیلا کی سیر ہو گئی، سکور بلیس ۲۰ ڈالر یعنی دو سو روپیہ۔



منیلا سے بہت سے لوگ سوار ہوئے۔ کیبن بھر گیا۔ بچّے جو پہلے سارے کیبن میں اُچھلتے کُودتے پھرتے تھے اپنی اپنی سیٹوں میں مقیّد ہو گئے لیکن موناباز نہ آ سکی۔ کبھی اُس سیٹ کے پاس کبھی اِس کے پاس۔ میرے بائیں ہاتھ ایک امریکن بہادر تشریف فرما ہوئے۔ آتے ہی بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے بریف کیس سے چھوٹا سا شطرنج کا ڈبّہ نکالا اور سلیقہ سے میز پر لگا کر اکیلے ہی کھیلنے لگے۔ کہیں اٹکتے تو فوراً بیگ سے کتاب نکالتے، کچھ دیکھتے اور اوندھی سیدھی آوازیں نکالتے ہوئے دوبارہ کھیلنے لگتے۔ کھانے سے ذرا پہلے ہوسٹس نے حسبِ دستور مشروبات کے بارہ میں پُوچھا۔ حضرت نے عینک اُتاری اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے عجیب سرور کے عالم میں فرمایا: "وہسکی ـــــ!" اِس کے بعد وہسکی آتی چلی گئی اور وہ پیتے چلے گئے۔ اِدھر گلاس خالی ہوتا اُدھر دوبارہ بھر دیا جاتا۔ کچھ دیر تک تو بچّے جام گنتے رہے ـــــ "ابّو! اب دو ـــــ اب تین ـــــ اب چار ـــــ اب پانچ ـــــ" بچّے گنتے ہوئے تھک گئے وہ پیتے ہوئے نہ تھکے ـــــ بلانوشی کا مطلب اس روز سمجھ میں آیا۔ عدم یاد آنے لگا ؎

ایک دو ساغروں سے کیا ہو گا
کوئی معقول انتظام کریں

کھانا آیا تو وہ صحیح معنٰی میں مردِ میدان ثابت ہوئے۔ جو آیا، جیسا آیا بڑی بلاغت کے ساتھ کھاتے چلے گئے (امریکہ کو شاید اِسی رعایت سے لوگ کھاتا پیتا مُلک

کہتے ہیں)۔ کھانے کے دَوران بھی شراب چلتی رہی حتیٰ کہ حضرت نیم دراز ہو کر نیم وا آنکھوں سے جام کو محض دیکھنے لگے۔ "ٹک ٹک دیدم۔ دَم نہ کشیدم"۔ ہوسٹس نے میز سے جام اُٹھانا چاہا تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا ؎

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے!

کھانے میں فلپائن کی بطخ کا گوشت بھی تھا۔ اِتنا لذیذ گوشت اِس سے پہلے کبھی نہ کھایا تھا۔ سُنا ہے چینی مُرغی کا گوشت بھی مزیدار ہوتا ہے ــــ ہوتا ہوگا ــــ ہم تو فلپائن کی بطخ کے گرویدہ ہو گئے۔ بچّوں کو ہم نے فرمائش کر کر کے کھلایا۔ پھل آئے۔ دیکھا کہ ٹوکری میں آم بھی رکھا ہے۔ آنکھوں پر یقین نہ آیا تو ہوسٹس سے پُوچھا کیا یہ آم ہے؟ فرمانے لگیں "جی ہاں! ہمارے ہاں تو آم ہی کہتے ہیں، آپ کے ہاں اِسے کیا کہتے ہیں؟" شوق سے اُٹھا لیا۔ کاٹا تو بدمزہ۔ سوچا یہ ہوسٹس خراب آم دے گئی ہے دوسرا تازہ منگوانا چاہیئے۔ دوسرا منگوایا تو وہ بھی ویسا ہی نکلا۔ پُوچھا کس مُلک کا آم ہے؟ ارشاد ہُوا ــــ "فلپائن کا" ــــ سب گِلے جاتے رہے ــــ فلپائن والے تو اِسی قسم کے آم کو آم کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ایسے کو گدھے بھی نہیں کھاتے ہیں۔ غالب یہ آم چکھ لیتے تو مفتی صدرالدین آزردہ سے ناحق آزردہ نہ ہوتے۔



بچّوں نے تو پھلوں کو بازیچۂ اطفال بنا لیا۔ کبھی یہ اُٹھا کبھی وہ، چکھ چکھ کر پھینکتے رہے۔ تلملا تلملا کر ہم انہیں منع کرتے رہے لیکن آفرین ہے ان فضائی میزبان خواتین پر کہ اُن کے ماتھے پر بَل نہیں آیا۔ ان کی ہر بات برداشت اور ہر فرمائش پُوری کرتی رہیں۔ اِسی پر بس نہیں کچھ چھوٹے موٹے تحفے بھی دیئے۔ طاہر کو جس کی عمر سات سال ہے مقناطیسی شطرنج عطا فرمائی۔ چھوٹی چھوٹی کاریں بھی دیں۔ ایک مُنّا سا رُوئی کا بنا ہُوا ہاتھی بھی عنایت فرمایا ــــ ایک کلاسیکی قسم کا لکھنے کا بکس بھی دیا۔ غرض بچّے نہال ہو گئے۔

اچانک وہ پُرانی سہیلی پچھلے کیبن سے تشریف لائیں اور بیگم سے کہنے لگیں اب اوسا کا آنے والا ہے مجھے اپنا پتہ لکھوا دیجئے میں کبھی آپ کے ہاں آؤں گی۔ ہم نے کہا "بی بی! اوسا کا تو جہاز کو ساڑھے چھ بجے پہنچنا ہے اور ابھی صرف ڈیڑھ بجے ہیں"۔ فرمایا "آپنے بجا فرمایا، پاکستان میں یہی وقت ہے لیکن جاپان میں چھ بج چکے ہیں اور آدھے گھنٹے کے بعد آپ اوساکا میں ہوں گے ــــ کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو واقعی شام ہو چکی تھی اور اندھیرا پھیل رہا تھا۔ جلدی جلدی اپنا سامان جو بے فکری سے اِدھر اُدھر بکھیر رکھا تھا سمیٹنا شروع کیا۔ بچّوں کے کپڑے بدلوائے۔ خود غسل خانہ میں جا کر نئے بلیڈ سے خوب گھس گھس کر شیو بنائی۔ دو چار بار آئینہ میں اپنی شکل بھی دیکھی اور آئینہ دیکھ کر اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے۔

ہاتھ مُنہ دھو کر باہر نکلے تو اعلان کیا گیا ہم پندرہ منٹ کے بعد اوساکا

انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اُترنے والے ہیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو روشنیاں ہی روشنیاں نظر آئیں، جہاز اوساکا شہر کے اُوپر چکّر لگا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ایئرپورٹ پر اُترے۔ بہت سی دعائیں پڑھنے کو جی چاہتا تھا گھبراہٹ میں سب بھُول گئیں۔ جہاز سے باہر نکلے تو سرد ہَوا کا جھونکا آیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے تو بہت گرم محسوس ہوئی۔ بہت سے مسافر یہاں اُترے تھے لہٰذا ہم بھی اُن کے پیچھے تیز تیز قدم مارتے ہوئے چلنے لگے۔ ایک برآمدہ ـــــ دوسرا ـــــ تیسرا ـــــ چوتھا۔ خبر نہیں کتنا سفر طے کر لیا۔

خیر صاحب! بھلا ہو جاپان والوں کا۔ بھلے لوگ ہیں۔ ہر کاؤنٹر سے ع

ہم بھی فارغ ہوئے شتابی سے۔

سب سے آخر میں سامان کی چیکنگ کی باری تھی۔ سامان اُن کے سامنے رکھا اور کہا ملاحظہ فرمائیے! ۔ پُوچھا ـــــ "یہاں کیسے آئے ہیں ـــــ؟" بتایا کہ ـــــ "وزٹینگ پروفیسر کی حیثیت سے آیا ہوں" ـــــ "پروفیسر ـــــ! آپ نے نعرہ مارا ـــــ "بس سامان کی چیکنگ کی ضرورت نہیں، آپ جائیے ـــــ!" ہم نے حیرت سے اُس کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ پھر سامان سمیٹا اور بنک میں پہنچ گئے۔ ٹریولر چیک دے کر جاپانی سکّہ حاصل کیا۔

گیٹ سے باہر نکلے تو دو حضرات لپک کر آگے آئے۔ "السلام علیکم!"۔



پروفیسر ہماگوچی تھے۔ اس گرمجوشی، محبّت اور خلوص کے ساتھ ملے کہ سفر کی ساری کوفت دُور ہو گئی۔ ہم نے حسبِ دستور لپک کر معانقہ کرنا چاہا تو اُدھر ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ فوراً خیال آیا کہ جاپان میں معانقہ تو کجا مصافحہ کرنے کا رواج بھی نہیں ہے لیکن لوگ اتنے احترام سے سر جھکا کر سلام کرتے ہیں کہ معانقے اور مصافحے کی کسر پُوری ہو جاتی ہے۔

پروفیسر کان کاگایا اور پروفیسر ہماگوچی دونوں ہی خلوص کے پُتلے نکلے۔ ہمارے ساتھ مصافحہ اور بچّوں کو پیار کیا۔ بیگم سے علیک سلیک کی اور بڑے خلوص اور احترام کے ساتھ ہمیں ہماری قیام گاہ تک پہنچایا۔ اور وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ کہہ کر رخصت ہوئے ۔

○

## ٢

گھر کے بڑے دروازہ سے داخل ہوتے ہی ایک لمبے قد کے سُرخ و سفید صاحب نے نستعلیق امریکی انگریزی میں "خوش آمدید" کہا۔ ساتھیوں نے تعارف کرایا کہ — "آپ فارسی صاحب ہیں!" — ہم — کہ طویل ہوائی سفر کی وجہ سے کچھ بہرے سے ہو رہے تھے سمجھے کہ آپ فارسی کے پروفیسر ہیں لہذا فوراً فارسی بگھاری — "آغا! حال شما چیست؟"۔ جواب میں آغا صاحب سراپا "چہ می کنم" سے ہو گئے — دل کا چور بولا — "اور بولو غلط سَلط پاکستانی کتابی فارسی —!" ہم نے جھرجھری سی لی، اپنے آپ کو سنبھالا اور انگریزی میں "How do you do?" کہہ کر بات آگے بڑھائی۔ جواب میں پھر مقفّیٰ، مسجّع صاف سُتھری دُھلی دُھلائی "قلعۂ معلّیٰ" کی انگریزی۔ تب کاگایا صاحب نے جو ہمارے چہرے پر پھیلے ہوئے اُوٹ پٹانگ سے تأثرات



پڑھ رہے تھے ہمیں ذرا بلند آواز میں بتایا کہ مخاطب موصوف کا اسمِ گرامی "فارسی" ہے اور آپ انگریزی کے پروفیسر ہیں تو بہت خفّت ہوئی۔ اِس علیک سلیک کے بعد گھر کے اندر داخل ہوئے تو احساس ہُوا کہ اپنا ہی گھر ہے ع

جس جگہ جا کر لگے وہ ہی کنارا ہو گیا

بڑے بڑے کمرے اور اکٹھے چار۔ کتابوں میں پڑھا تھا کہ جاپان میں جگہ کی بہت قلّت ہے لہذا لوگ ایک ایک دو دو کمروں میں گزارا کرتے ہیں، اِس لئے ہم نے بھی اپنے لئے جس مکان کا نقشہ ذہن میں مرتّب کیا تھا وہ دو $\frac{٢}{}$ کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہمیشہ توقّعات سے بڑھ کر دیتا ہے اِس لئے ہم نے شکر ادا کیا اور گھر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ ڈرائنگ روم ہے، ہر چیز موجود۔ یہ سونے کا کمرہ ہے، پوری طرح مرصّع۔ یہ بچّوں کے سونے کا کمرہ ہے، جاپانی فرشی بستروں سے آراستہ۔ یہ ڈائننگ ہال ہے اور واقعی ہال ہے، طویل و عریض — یہ باورچی خانہ ہے، پُوری طرح مسلّح — یہ غسل خانہ ہے — یہ سٹور ہے — یہ دوسرا اسٹور ہے — وغیرہ وغیرہ — کچھ دیر تو رفقائے کار ساتھ تھے لہذا — "کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے تھے —" جب وہ چلے گئے تو کیفیت یہ ہو گئی — "دیکھئے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت"۔

سامان کھولا لیکن بستر نہ کھولے۔ بعد میں احساس ہوا کہ بستر کھولنا ضروری تھے کیونکہ جاپانی لحاف میں سونے کی تو — "اندر کفن کے سر ہے تو باہر کفن کے پاؤں" — کا مضمون پیدا ہوگیا — معلوم ہوا کہ ہم نے قد بڑھاتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ ہمیں کبھی جاپان بھی جانا ہوگا۔ اب ایک ہی رستہ باقی تھا کہ بستر میں سے اپنا پاکستانی لحاف نکالیں۔ بستر کھولنے لگے اور — "جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا" — باقی سب لوگ سو چکے تھے۔ ہم نے بھی سونے کی کوشش کی۔ کوئی بارہ بجے کا عمل تھا لیکن نیند نہ آتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں ابھی صرف آٹھ بجے تھے اور آٹھ بجے کا وقت شریف لوگوں کے سونے کا وقت نہیں ہوتا۔ ہم نے حساب لگانا شروع کیا کہ جب یہاں ایک بجے گا پاکستان میں ۹ بجے ہوں گے، دو بجیں گے تو دس بجیں گے۔ غرض اس طرح حساب کرتے کرتے سو گئے کیونکہ یہ بھی شرفاء کا آزمودہ نسخہ ہے کہ اگر نیند نہ آ رہی ہو تو حساب کرنا شروع کر دو نیند آ جائے گی۔

صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا سورج نکلا ہوا تھا۔ گھر سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ ہمارا مکان تین منزلہ عمارت میں تھا۔ سطح زمین پر ہم تھے۔ ساتھ کے سیڑھیوں والے دروازہ پر "بورڈ" لگے تھے۔ ایک پر انگریزی میں "A · FARICY" لکھا تھا۔ ہم نے سوچا کہ پروفیسر موصوف کا نام "عربی فارسی" ہوگا — دوسرے پر کوئی عجیب و غریب لاطینی قسم کی چیز اوپر سے نیچے کی طرف لکھی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جاپانی زبان میں ہمارے دوسرے ہمسائے پروفیسر حن چ کا اسم گرامی ہے جو چینی زبان کے پروفیسر ہیں۔ مکان کا سیاسی نقشہ یہ تھا کہ نیچے پاکستان ہے، اوپر امریکہ اور اس سے بھی اوپر چین — گویا امریکہ یہاں بھی ہمارے سر پر سوار ہے ع

بچ کے جائیں گے کہاں اے غمِ دوراں تجھ سے

بعد کے تجربہ نے بتایا کہ صرف ہمارے ہی نہیں پورے جاپان کے سر پر سوار ہے۔

ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں۔

یونیورسٹی جانے کی تیاری پکڑی۔ نہائے دھوئے، شیروانی اور شلوار قمیص پہن کر اپنے خضر کا انتظار کرنے لگے۔ نو بجے دو طلباء تشریف لائے اور ہم اُن کے ساتھ یونیورسٹی روانہ ہوئے ؎

پہلا سفر ہے اجنبی رستوں کے شہر کا
اے دل سنبھل یہ مرحلہ ہوتا ہے قہر کا

خضر آگے آگے اور ہم سکندر کی طرح پیچھے پیچھے۔ کوئی تین منٹ میں یونیورسٹی پہنچ گئے۔ یونیورسٹی ایک پانچ منزلہ پرانی عمارت میں ہے۔ فضا صاف ستھری، سنجیدہ اور خاموش ہے۔ ہمارے ہاں کا شور شرابا نہیں ہے۔ اللہ! یہ کیسی یونیورسٹی ہے — ؟ ہم یہی سوچ رہے تھے کہ خضر نے فرمایا — "لیجئے یہ آپ کا کلاس روم ہے اور طلباء اور طالبات آپ کے منتظر ہیں —"

کاگایا صاحب (صدرِ شعبہ) کلاس کے دروازے تک آئے اور اندر لے گئے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا لیکن کلاس روم میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ طلباء "گلِ محمد" بنے بیٹھے رہے۔ صدرِ شعبہ نے فراخ دلانہ لفظوں میں کسی کے متعلق تعریفی کلمات کہنا شروع کیئے اور مسلسل دو تین منٹ تک کہتے رہے۔ طلباء نے تالیاں بجائیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ہمارا تعارف کروا رہے تھے اور یہ ہمارا استقبال ہو رہا ہے۔ کسی جاپان شناس کا یہ فقرہ بہت یاد آیا کہ "جاپانی لوگ تعریف کرنے میں حاتم ہیں لیکن اپنی صحیح رائے کا اظہار کرنے میں بخیل" — اب ہمارے کچھ کہنے کی باری تھی۔ ہم نے "پہلے تولو پھر بولو" — کے اصول پر عمل کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تو لفظ بہت بھاری نکلے، زبان سے اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ تولتے بات نہ بنی تو جو مُنہ میں آیا کہتے چلے گئے اور طلباء خاموشی سے سُنتے رہے۔ جب ہم ذراسی دیر کے لئے سانس لینے کو رُکے تو تالیوں کا طوفان اُٹھا۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں گویا طلباء چاہتے تھے کہ اتنی تالیاں بجاؤ کہ اس شخص کو مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کاگایا صاحب ہمیں کلاس روم سے لے کر اُوپر چوتھی منزل پر شعبۂ اُردو کے کمرہ میں لے آئے۔

یہاں ہر شعبہ کے اساتذہ ایک ہی دار المطالعہ میں اکٹھے بیٹھے ہیں۔ ہر شعبہ کا دار المطالعہ الگ ہے اور ہر استاد کی مطالعہ کی نشست (Study chair) علیحدہ۔



ہمارے ہاں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے سٹاف روم میں وہ دُھوم دھڑکّا ہوتا ہے کہ الاماں! اور وہ تُوں تڑاک ہوتی ہے کہ الحفیظ! لیکن یہاں اساتذہ اکٹھے بیٹھ کر بھی خاموشی سے اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں پڑھتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ ہر شخص اپنے کام میں مصروف ہے۔ ہم نے پہلے روز اپنی عادت کے مطابق کچھ چُوں چراں کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری جانب سے حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ ناچار کتاب لے کر مطالعہ شروع کر دیا اور سوچنے لگے کہ جاپان بھی تو آخر مشرقی مُلک ہے اس میں یہ عادتیں کہاں سے آگئیں؟ لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ اِن لوگوں نے امریکہ سے سب کچھ سیکھا ہے سوائے بُری عادتوں کے اور ہم نے بھی سب کچھ سیکھا ہے سوائے اچھی عادتوں کے — ہمارے مشرق — اور — جاپان کے مشرق میں "بعید" کا فرق ہے —!

اپنے شعبہ کے اساتذہ سے قریب سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ کاگایا صاحب سنجیدہ، مستقل مزاج، محنتی اور دُھن کے پکے ہیں — ہاماگوچی صاحب تیز طرّار، ذہین اور فطین ہیں — کاتاؤکا صاحب کام کے رسیا، سپورٹسمین اور خدمت گزار ہیں — ماٹویہ صاحب بے تکلّف، میٹھے اور ہم زبان ہیں — کواجیمہ صاحب خاموش اور کتابی ہیں — مراتا صاحب بڑے اور شفیق ہیں — کوندو صاحب، گوندو ہیں یعنی کبھی کبھی کوندے کی طرح آلپکتے ہیں اور پھر ہفتوں شکل نہیں دکھاتے۔ لیکن ایک بات سب میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ سب ہی خلیق، ملنسار، مسافر نواز اور

ہمدرد ہیں۔ آتش نے شاید ہمارے شعبہ کے لیے ہی کہہ رکھا تھا کہ ؎

"سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

ہمارے فرائض میں یہ شامل کیا گیا کہ ہم طلبہ سے اُردو زبان میں گفتگو کرکے اُن کے لئے مشق کرنے کا موقعہ بہم پہنچائیں یعنی بلاتکلف اُن سے کہیں کہ ع

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

پہلے ہی روز محسوس ہؤا کہ جاپانی لوگ سوال کا جواب دینے میں بہت محتاط ہیں اور جب تک اُنہیں کسی چیز کے بارہ میں حتمی طور پر یقین نہ ہو اُس کے بارہ میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے۔ ہماری طرح ظنّ و تخمین کے قائل نہیں۔ ہم نے ایک رفیقِ کار سے پُوچھا "کل دس بجے آپ تشریف لائیں گے نا ــــ؟" جواب ملا "شاید دس بجے آ سکوں گا، ہو سکتا ہے ایک آدھ منٹ اِدھر اُدھر بھی ہو جائے" ــــ یہاں تک تو احتیاط غنیمت تھی۔ اِس کے بعد کلاس میں جو کچھ ہؤا وہ بھی سُن لیجئے!

ایک طالب علم خدا معلوم کیوں بار بار اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتا تھا۔ ہم نے تفنّنِ طبع کے طور پر سوال کیا کہ: ــــ

"آپ کے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں؟"

صاحبزادہ نے باقاعدہ گننے کے بعد جواب دیا۔ "پانچ!"



دوسرے سے سوال کیا۔ اس نے بھی باقاعدہ گننے کے بعد "پانچ" کا حکم لگایا۔ تیسرے ــــ چوتھے ــــ اور پانچویں نے بھی یہی حرکت کی۔ ہم نے سراسیمہ ہو کر پوچھا:

"آپ حضرات بار بار گنتے کیوں ہیں؟"

جواب ملا "ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہر سوال کا جواب دینے سے پہلے احتیاط کرو اس لئے ہم ایسا کرتے ہیں"۔ اس لئے وہ لوگ جو ہمارے بعد جاپان آئیں وہ محتاط رہیں اور کسی جاپانی طالب علم سے یہ سوال نہ کر بیٹھیں کہ:

"آپ کے سر میں کتنے بال ہیں ــــ؟"

ورنہ طالب علم بے چارے کی عمر ــــ سر کے بال گننے میں گزر جائے گی ــــ!

اتنی احتیاط تو صرف جاپانی کرتے ہیں یا ہمارے ماسٹر عبدالعزیز! ــــ ماسٹر عبدالعزیز ہمارے گاؤں میں پڑھاتے تھے اور حزم و احتیاط کے داعی تھے۔ ایک بار ہم سے پُوچھا "انسان کے دائیں ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہوتی ہیں؟"

ہم نے عرض کیا ــــ "پانچ ــــ!"

"کیا تمہیں یقین ہے ــــ؟"

"پھر سوچ لو ــــ!"

"جی سوچ لیا ــــ!"

"لیکن ــــ" ماسٹر صاحب نے فاتحانہ انداز میں اپنا دایاں ہاتھ ہوا

میں لہرایا۔ "دیکھو میرے داہیں ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں ——!"

ہم نے خدا جانے کس تائیدِ غیبی کے طفیل برجستہ کہا:

"جناب مَیں انسان کے ہاتھ کی بات کر رہا تھا۔"

اِس کے بعد قبلہ ماسٹر صاحب نے اپنی "انسانیت" کا ثبوت دینے کے لئے ہم سے وہ سلوک کیا جو —— حزبِ اقتدار والے حزبِ اختلاف والوں سے کرتے ہیں —— یعنی مار مار کر بُھرکس نکال دیا۔ چنانچہ یہ واقعہ آج تک ہمیں یاد ہے اور اِس تجربہ نے اِس واقعہ کو ذہن میں اَور زیادہ اُجاگر کر دیا ہے۔

یہاں کا عالم یہ ہے کہ دوکاندار سے دس دس ین کی پانچ چیزیں لیجیئے تو وہ اپنے سوراباں پر حساب کر کے آپ سے پچاس ین وصول کرے گا زبانی کلامی پر اعتبار نہیں کرے گا۔ یہ سوراباں بھی عجیب چیز ہے۔ یہ لوگ اس پر کروڑوں کا حساب منٹوں میں کر لیتے ہیں اور مجال ہے کوئی غلطی کر جائیں غلطی رقم واپس کرتے وقت کر جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے بیٹے ماہر کو دس ہزار ین کا نوٹ دے کر سَودا سلف لانے کے لئے بھیجا۔ حضرت اڑھائی ہزار ین کا سَودا بھی لے آئے اور ساڑھے آٹھ ہزار ین بھی واپس لے آئے۔ ہم نے فوراً واپس بھیجا کہ دکاندار سے کہو کہ اُس نے ہزار ین کا ایک نوٹ غلطی سے زاید دے دیا وہ واپس کر لے۔ دکاندار مُصِر تھا کہ اُس نے زائد نہیں دیا۔ بچّہ واپس آگیا۔ ہم گئے۔ دکاندار اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ جب ہم نے اس سے کہا تو بصد دقّت وہ اس بات پر راضی



ہُوا کہ رات کو وہ کمپیوٹر پر حساب کرے گا اگر واقعی دکان کے حساب میں ایک ہزار ین کی کمی ہوئی تو وہ واپس لے لے گا ورنہ نہیں لے گا۔

حد ہو گئی صاحب! ایک ہزار ین —— ایک ہزار ین ہوتے ہیں۔

دُکاندار نے رات کو حساب کیا واقعی ہزار ین کی کمی تھی وہ نوٹ اُس نے واپس لے لیا اور آج تک وہ ہماری "دیانت" کا معترف ہے اور ہم اُس کی دیانتداری کے باب میں رطب اللّسان ہیں ع

"مَن ترا مُلّا بگویم تُو مرا حاجی بگو"

یہاں پہنچتے ہی ہمیں یہ نصیحت کی گئی کہ یہاں بیمار ہونا گناہ ہے کیونکہ جسمانی لحاظ کے علاوہ مالی لحاظ سے یہ بہت مہنگا کام ہے۔ ہم نے اِس نصیحت کو پلّے باندھ لیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے —— یہ دیکھیئے —— ابھی تک گرہ میں باندھ رکھا ہے لیکن ہماری چھوٹی بیٹی جس کی عمر اکتوبر ۷۵ء میں تین ماہ تھی اِس نصیحت پر عمل نہ کر سکی کیونکہ ابھی وہ نا سمجھ تھی۔ بیچاری کو نمونیہ نے آ لیا ہسپتال میں رہی۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایک روز اُس کی طبیعت خراب تھی اپنے ایک ساتھی کو فون کیا کہ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنے میں ہماری مدد کریں کیونکہ یہاں کے اَور مکینوں کی طرح ڈاکٹر بھی جاپانی زبان کے علاوہ اَور کوئی زبان نہیں جانتے۔ صاحب موصوف نے کہا:

"اوہو! بچّی بیمار ہو گئی؟ آج تو اتوار ہے!"

"کیوں اتوار کو بیمار نہیں ہونا چاہیئے ؟"

"ہرگز نہیں ! بھائی اتوار کو ہر چیز کی چھٹی ہوتی ہے"

"تو پھر کیا کریں ؟"

"اچھا مَیں کچھ کرتا ہوں۔ آپ میرا انتظار کریں !"

آپ نے بڑی دقّت سے ایک "اتواری ہسپتال" کا پتہ چلایا۔ تشریف لائے۔ مہربانی فرمائی۔ بچّی کو وہاں لے کر گئے۔ علاج معالجہ ہوگیا۔ "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔" اتوار کو باقی سب ہسپتال بند ہوتے ہیں سوائے Sunday Hospital کے۔ یہ ہسپتال صرف اتوار یا دیگر چھٹیوں کے دنوں میں کھلتے ہیں، باقی دنوں میں چھٹی کرتے ہیں — !

ہمارے قریب ہی ایک ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر کانو — دوسری جنگِ عظیم میں برما کے محاذ پر لڑتے رہے ہیں اس لئے تھوڑی تھوڑی انگریزی بھی سمجھ لیتے ہیں۔ مہربان اور شفیق ہیں لیکن حسبِ دستور ہفتہ کی شام اور اتوار کے دن مریض نہیں دیکھتے۔ سُوئے اتفاق سے بچّی ایک بار پھر ہفتہ کی شام کو بیمار ہوگئی۔ ہم نے توکّل علی اللہ ڈاکٹر کانو کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود نہ تھے واپس آئے اور علاج کی کوئی اَور تدبیر سوچنے لگے۔ اتنے میں باہر دروازہ کی گھنٹی بجی۔ باہر نکلے تو ڈاکٹر کانو تھے۔ فرمانے لگے "مَیں گھر آیا تو مجھے بتایا گیا کہ آپ آئے تھے، کیا بات ہے ؟"



آپ نے بچّی کو دیکھا، معائنہ کیا، دوا دی اور تشریف لے گئے۔ ہم نے تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنے جاپانی ساتھیوں سے ڈاکٹر صاحب کی اِس شفقت اور مہربانی کا تذکرہ کیا لیکن کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ ڈاکٹر کسی مریض کو دیکھنے کیلئے اس کے گھر بھی جا سکتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر مریض کو دیکھنے کے لئے گھروں میں نہیں بُلائے جاتے مریض کو ہسپتال پہنچایا جاتا ہے۔ ایمبولنس سروس مُفت ہے اور ہر وقت مستعد۔ فون کیجئے ایمبولنس حاضر ہے۔ مریض کو لٹائیے ہسپتال لے جائیے۔ ہم اس سہولت سے اِس لئے محروم ہیں کہ ایمبولنس بُلانے کے لئے بھی ٹیلیفون کرنا پڑتا ہے اور ٹیلیفون سُننے والے جاپانی زبان کے علاوہ اَور کچھ نہیں جانتے ع

زبانِ یارِ من ترکی و من تُرکی نمی دانم

یہاں تک پہنچے تو پھر ع مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات ! اپنے ایک رفیقِ کار کو فون کیا کہ بچّی کی طبیعت خراب ہے اسے ہسپتال لے جانا مقصود ہے۔ آپ فوراً تشریف لائے۔ بچّی کو ہسپتال لے گئے۔ دو تین گھنٹے ہمارے ساتھ رہے، تسلّی دیتے رہے، ہمیں کوئی دِقّت نہیں ہونے دی۔ اگلے روز معلوم ہُوا کہ اُن کی اپنی بچّی شدید طور پر بیمار تھی لیکن وہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر ہمارے پاس آ گئے تھے۔ اب بتائیے ! اسے کیا کہا جائے ؟ کون سے الفاظ ہیں جو ایسے موقعوں پر تشکّر کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ؟

یہ تو نہیں کہ یہاں غریب نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں اور بہت ہوتے ہیں فقیر

البتہ نہیں ہیں یعنی مانگنے والے۔ ان تین مہینے کے عرصہ میں صرف ایک
فقیر نے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ ہم یہاں بچوں سمیت بچوں کے پارک میں
تفریح کے لئے گئے ہوئے تھے اور خود لوگوں کے لئے سامان تفریح بنے ہوئے
تھے یعنی لوگ عجوبہ سمجھ کر ہمیں دیکھ رہے تھے بلکہ ایک منچلی خاتون نے تو باقاعدہ
اس انداز سے ہماری تصویریں اتاریں جس طرح لوگ چڑیا گھر میں جانوروں کی تصویریں
اتارتے ہیں کہ اتنے میں ایک فقیر سامنے آیا اور دست سوال دراز کیا۔ ہم نے حاتم کی
قبر پر لات مارتے ہوئے ایک سو ین (تقریباً تین پاکستانی روپے) اسے مرحمت
فرمائے۔ اس نے جھک کر دو تین بار شکریہ ادا کیا اور اپنی راہ پر ہو لیا۔ دو تین مقامی
باشندوں نے اسے کچھ کہا غالباً یہ کہ "غیر ملکی لوگوں سے مانگتے ہوئے اسے شرم
آنی چاہیے" اور اس نے کھیسیں نکالتے ہوئے انہیں کچھ جواب دیا۔ غالباً یہ کہ
"تیر لگا" لے لیتے ہیں ورنہ تیرے کس کام کے ہیں ان کا تو ایک پیگ بھی نہیں
آتا ہے۔" ہمارا یہ اندازہ اس لئے درست ثابت ہو رہا ہے کہ اس دن کے
بعد سے آج تک کوئی فقیر سامنے نہیں آیا۔ بلکہ ایک دوبار تو ہم باقاعدہ
خیرات کی نیت سے ریزگاری ہاتھ میں لے کر چلے لیکن کوئی نہ ملا ع

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

سپر مارکیٹ (Super Market) کے کوڑے کے برتن کے سامنے
ایک صاحب کھڑے تھے اور اطمینان سے سگریٹ پی رہے تھے ایک گھنٹہ بعد ادھر



سے گزر ہوا تو وہ اسی اطمینان سے اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ انہیں شاید کسی کا
انتظار تھا۔ اتنی دیر میں مارکیٹ کے اندر سے ایک شخص نکلا اس نے باسی
ڈبل روٹیاں کوڑے کے برتن میں پھینک دیں۔ آپ اسی شان استغنا سے
کوڑے کے برتن کے پاس آئے "ڈھکنا اٹھایا" ڈبل روٹیاں اٹھائیں اور
چل دیئے۔ ہمارے پاس سے گزرے تو ان کے چہرے پر مسرت اور خوشی کی جو
لہر تھی وہ شاید آدھی دنیا فتح کرنے کے بعد سکندر کے چہرے پر بھی پیدا نہ ہوئی ہو گی۔
اگلے روز اتفاق سے وہ ہمارے سامنے آ گئے۔ ہم نے انہیں کچھ دینا چاہا آپ نے
حقارت سے ٹھکرا دیا کہ ع

"شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں"

قوت کا یہ عالم بھی ہم نے دیکھا ہے کہ کئی فقیر فقرا کھلے آسمان کے نیچے
فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں حالانکہ پارہ گر کر ایک دو ڈگری پر پہنچا ہوا ہوتا ہے اور
ہم لوگ دانت بجاتے پھرتے ہیں۔ اللہ! یہ کڑکتے جاڑوں میں کیسے اتنے اطمینان
سے سو لیتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بہت دنوں بعد ملا تو یہ صاحب سے ملا کہ "یہ
لوگ اندر سے گرم ہوتے ہیں" یعنی شراب پیتے ہیں اور پھر موسم کو للکارتے ہیں ع

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

شراب یہ لوگ یوں پیتے ہیں جیسے ہمارے یہاں پانی پیا جاتا ہے۔ یہ لوگ پانی بالکل
نہیں پیتے۔ پانی کی جگہ بیئر چائے پیتے ہیں اور اس کے بعد صرف شراب پیتے ہیں۔

شام کو کسی طرف نکل جائیں تو اقبال یاد آنے لگتا ہے ؎

چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

کھانے کے معاملہ میں یہ لوگ سمندر کی ہر جاندار چیز کھا جاتے ہیں اور ہر نباتی شے چر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اِردگرد سمندر ہی سمندر ہے اس لئے ان لوگوں نے خوراک کے خزانے اُگلوا لئے ہیں۔ باہر کی دُنیا سے رابطہ قائم ہونے سے پہلے ہی جاپان سمندری خوراک کے معاملہ میں خود کفیل تھا۔ زراعت بھی بہت عام ہے اور زرعی آلات بھی ایک سے ایک بڑھیا اور عمدہ موجود، صرف زمین نہیں ہے۔ اتنے چھوٹے چھوٹے تو جزیرے ہیں وہاں کارخانے بنائیں یا زراعت کریں؟ جو زمین بھی کارخانوں اور مکانوں سے بچ رہی ہے وہاں چاول اور پھل اُگاتے جاتے ہیں۔ زمین میسّر نہ آئے تو گملوں میں خوراک کے پودے لگا لیتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں نے ہر حال میں اور ہر رنگ میں بھوک کو زیرنگیں کر رکھا ہے۔ گوشت میں ہر چیز کا گوشت کھا جاتے ہیں۔ سؤر کا گوشت اُن کی مرغوب غذا ہے۔

غالبؔ کو گوروں نے گرفتار کرنے کے بعد پوچھا تھا "مسلمان ہو؟" اُس نے کہا تھا "جی ہاں۔ آدھا مسلمان!"

"آدھے مسلمان سے کیا مراد ہے؟"

غالبؔ نے کہا "شراب پیتا ہوں۔ سؤر نہیں کھاتا۔"



جاپانی اِس معاملہ میں "پورے مسلمان" ہیں۔

غالبؔ کو اِس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی "بن گیا روئے آب پر کائی"۔ جاپانیوں نے اطمینان سے کائی کو دیکھا، اُسے اکٹھا کیا اور کھا گئے۔ سبزہ اُگاتے بھی ہیں اور سبزہ کھاتے بھی ہیں۔ اُگانے میں یہ کمال حاصل ہے کہ گملوں میں مُنّے مُنّے پودے اُگا رکھے ہیں اور وہ باقاعدہ پھل دے رہے ہیں۔ بیس بیس سال کی عمر کے درخت ہیں اور گملوں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہیں پیدا ہوتے، بڑھتے، پھولتے اور پھلتے ہیں۔ بلکہ ایک گملے میں ہم نے بڑ کا درخت دیکھا۔ چھوٹا سا بڑ، گھنی چھاؤں اور پوری خصوصیّات موجود۔ عمر کوئی پچاس برس کے قریب! مارکیٹ میں بِک رہا تھا لیکن قیمت ہماری پہنچ سے باہر تھی ورنہ اِس وقت ہمارے ڈرائنگ روم میں رکھا ہوتا۔ پھولوں کی تو بات چھوڑیئے کہ اپنے ہاں بھی گملوں میں اُگائے جاتے ہیں یہاں کینو اور سنگترہ کے درخت گملوں میں اُگتے اور پھل دیتے ہیں۔ کہیئے تو ایک دو نمونہ کے طور پر بھجواؤں؟ (ڈاکٹر وزیر آغا توجہ فرمائیں!)

زمین کم ہے اِس لئے گاڑیاں بھی زمین سے اُوپر کم اور زمین کے نیچے زیادہ چلتی ہیں۔ زمین دوز ریل گاڑیوں کا نظام بہت عمدہ ہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد ہر سٹیشن سے گاڑی چھوٹتی ہے اور سٹیشن بھی کئی کئی منزلہ یعنی سیڑھیاں اُتر کر سو فٹ نیچے جائیے تو ایک سٹیشن، دو سو فٹ نیچے دوسرا، تین سو فٹ نیچے تیسرا اور چار سو

فٹ نیچے چوتھا۔ دائیں کو جانا ہو تو پلیٹ فارم نمبر ۱، بائیں طرف جائیے تو دو ۲، اُوپر جائیے تو تین ۳، نیچے جائیے تو چار ۴ علیٰ ہذا القیاس! اِن منزلوں نے مسافروں کا ناک میں دَم کر رکھا ہے اور ہم جیسے مسافروں کے لئے جو لکھی ہوئی جاپانی پڑھ نہیں سکتے اور بولی ہوئی جاپانی سمجھ نہیں سکتے ایک طرفہ عذاب ہے۔ اب تک یہ عالَم ہے کہ اکیلے سفر نہیں کر سکتے اور غالباً یہاں کے باشندے بھی ابھی اِس نظام پر پُوری طرح حاوی نہیں کیونکہ اکثر غلط گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک مہمان کو ٹوکیو سے آنا تھا ہم ایک رفیقِ کار کی معیّت میں اُنہیں لینے کے لئے اوساکا کے بڑے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک جگہ سے گاڑی لی۔ دوسری جگہ گاڑی بدلی، تیسری جگہ بدلی۔ تین منٹ کے بعد ہمیں منزلِ مقصود پر پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ جب گاڑی کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی اور وہ اُسی زنّاٹے سے چلتی رہی تو گارڈ سے پُوچھا۔ آپ نے بتایا کہ ہم غلط گاڑی میں سوار ہو گئے ہیں اور یہ گاڑی اب صرف پچاس کلومیٹر دُور کیوتو کے سٹیشن پر جا کے رُکے گی ہمیں تو جو کوفت ہونا تھی وہ ہوئی زیادہ خیال اِس بات کا تھا کہ وہ مہمان جو ٹوکیو سے آ کر اوساکا میں ہمارا انتظار کر رہا ہو گا وہ کتنا پریشان ہو گا۔ خیر کیوتو سے بو اپسی ڈاک (یعنی ڈاک گاڑی سے) واپس آئے۔ اِس طرح دنیا کی سب سے تیز رفتار گاڑی پر سفر کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ بارك الله لنا! مہمان موصوف بڑے گیٹ پر سراسیمہ اور پریشان کھڑے تھے اُنہیں کیوتو کا سفر نامہ سُنایا اور سبکدوش



ہوئے۔

دُنیا کی سب سے تیز چلنے والی ٹرین ہکاری جسے یہ لوگ "شِین کان سین" کہتے ہیں عجیب و غریب گاڑی ہے۔ گاڑی کیا ہے ہوائی جہاز، بلکہ ہمارے ہاں تو ہوائی جہاز بھی شاید اتنے تیز نہیں اُڑتے جتنا تیز یہ چلتی ہے۔ اس کی رفتار ۲۰۰ سے ۲۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ تک ہے۔ ٹوکیو سے اوساکا تک کا ۵۱۰ کلومیٹر کا فاصلہ تین گھنٹے دس منٹ میں طے کرتی ہے۔ چلتی بھی ہے، رُکتی بھی ہے، مسافر اُتارتی بھی ہے، چڑھاتی بھی ہے اور پھر اس قلیل وقت میں اوساکا بھی پہنچ جاتی ہے۔

یہ گاڑیاں یعنی ہکاریاں ہر پندرہ منٹ کے بعد ٹوکیو سے چلتی ہیں اور ہر پندرہ منٹ بعد اوساکا سے روانہ ہوتی ہیں۔ یہ چکّر صبح چھ بجے سے شروع ہو کر رات گیارہ بجے تک برابر جاری رہتا ہے۔ اگر حساب کیا جائے تو بات کہاں کی کہاں جا پہنچتی ہے لیکن ہم حساب کیوں کریں —— آخر حساب دان کس مرض کی دَوا ہیں؟

گاڑیاں وقت پر آتی اور وقت پر جاتی ہیں۔ کیا مجال جو ایک منٹ اِدھر اُدھر ہو جائے۔ لیکن ہکاری اِس معاملہ میں بھی سب سے نیاری ہے۔ لیٹ ہو تو منٹوں کے حساب سے نہیں گھنٹوں کے حساب سے لیٹ ہوتی ہے کیونکہ جتنی تیز رفتار ہے اُتنی ہی نازک مزاج بھی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک گاڑی ہکاری محض اِس نے ایک گھنٹہ

لیٹ ہو گئی کہ اُوپر بجلی کے تار میں ایک پتنگ اٹکی ہوئی تھی۔ گاڑی رُکی، پتنگ
اُتاری گئی تب چلی اور اس پتنگ کی وجہ سے بعد میں چلنے والی پینتیس ہکاریوں کا
سفر منسوخ کرنا پڑا۔

ہکاری نے جہاں اور بہت سی ناممکن باتوں کو ممکن بنا دیا ہے وہاں بعض
مسلّمات کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ اقبال کا دعویٰ تھا کہ "ہے منزلِ حیات میں
ہر تیز پا خموش" لیکن اقبال کے زمانہ میں ہکاری نہیں تھی۔ خدا معلوم ریلوے
لائن کے قریب رہنے والوں نے کانوں کا بیمہ کرا رکھا ہے یا نہیں ——؟

ذکر جاپانیوں کے کھانے پینے کا تھا یہ گاڑی درمیان میں جانے کہاں سے
آٹپکی۔ شراب پینے والے تو سبھی ہیں لیکن شراب پی کر "جگر مرادآبادی" ہو جانے والے
کم ہیں۔ جگر کو تو ہم نے ایک مشاعرہ میں دیکھا تھا "پا بدستِ دِگرے دست بدستِ
دِگرے" کا مضمون تھا۔ حبیب جالب نے بھی ایک بار ہماری گناہگار آنکھوں
کے سامنے "جگر مرادآبادیاں" کی تھیں لیکن یہاں یہ مضمون متروک ہے۔ لوگ شریفوں
کی طرح گھروں میں بیٹھ کر بیوی بچّوں کے ساتھ پیتے ہیں، پی کر سرِ راہ خرمستیاں نہیں
کرتے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو اُس کو مردود اور مطعون کہنے کی بجائے اُس سے
ہمدردی کرتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکھڑاتا ہوا نظر آئے تو اُسے سہارا دیتے ہیں۔
گاڑی میں ایسا شخص سامنے آجائے تو اُس کے لئے بیٹھنے کی جگہ خالی کر دیتے ہیں۔
"دروغ بر گردنِ راوی"، ہمارے ایک رفیقِ کار نے بتایا کہ ایک صاحب بلاناغہ



دھت ہو کر سرِ شام لوٹتے تھے۔ اپنے سٹیشن تک تو پہنچ جاتے تھے لیکن گھر کا
رستہ بھول جاتے تھے۔ سٹیشن کا عملہ انہیں گھر پہنچا آتا تھا لیکن تابکے؟ آخر
سٹیشن والوں نے اُن کا علاج ڈھونڈھ نکالا۔ اُنہیں بنچ پر لٹا کر ان کی ٹانگ
بنچ سے باندھ دیتے تھے کہ غفلت میں ریلوے لائن میں نہ کود پڑیں۔ حضرت
وہاں پڑے رہتے تھے۔ رات کے پچھلے پہر نشہ ٹوٹتا تو اپنے آپ کو بنچ سے
کھولتے اور گھر پہنچ جاتے۔

عام طور پر زیادہ پئے ہوئے لوگ دوسروں سے بدتمیزی نہیں کرتے لیکن
اگر وہ ایسا کر بھی لیں تو لوگ بُرا نہیں مانتے۔ لیکن ایک بار ہم ایک صاحب کی
زد میں آگئے۔ ہم گھر کا سودا سلف خریدنے کی غرض سے ایک دکان میں کھڑے
تھے کہ یکایک ایک صاحب آدھمکے اور ہماری طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا
ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کالا کالا ہے کیونکہ جاپانی حضرات مصافحہ نہیں کرتے ہم
نے ازراہِ مروّت مصافحہ کیا تو "مدِ مصافحہ" نے ہاتھ کو جکڑ لیا۔ اب ہم ہاتھ چھڑانا
چاہتے ہیں وہ ہاتھ چھوڑنا نہیں چاہتے اور جوش ملیح آبادی کے اسرار احمد خان
ملیح آبادی کی طرح "مہین مہین" مسکرائے چلے جاتے ہیں۔ دکاندار خاتون نے
ہمیں تسلّی دی "کوئی بات نہیں، یہ نشے میں ہیں"۔ اسی پر بس نہیں حضرت نے رُوئے
سخن ہماری طرف کر کے فصاحت اور بلاغت کے دریا بہانے شروع کر دیئے۔ ہم
بہتیرا کہتے رہے کہ صاحب! ہمیں جاپانی زبان نہیں آتی لیکن اُن کا لیکچر جاری رہا۔

خاتونِ محترم بار بار اُنہیں کہتی کہ آپ کا بہت بہت شکریہ اب انہیں اجازت دیجئے"، لیکن اُن کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ (جُوں غالباً جاپان میں نہیں ہوتی ورنہ اُن کے کپڑوں کی غلاظت اور سر کے بالوں کی فراوانی کے طفیل اس کے پنپنے کے سنہری مواقع موجود تھے) آخر ایک گھنٹہ یعنی نصف جس کا نصف گھنٹہ ہوتا ہے گزر گیا تو ہمیں تاؤ آیا۔ ہم نے کہا "ہم ابھی پولیس کو فون کرتے ہیں" پولیس کے نام پر وہ صاحب اَور زیادہ نشے میں آگئے۔ جوشِ خطابت دکھانے لگے۔ یکایک آپ کو جیسے کوئی کام یاد آیا آپ نے ہمارا ہاتھ چھوڑا، جُھک کر نہایت ادب سے سلام کیا اور چلے گئے جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ ہم نے کہا "پولیس سے یہ لوگ نہیں ڈرتے؟" جواب ملا "نہیں! پولیس انہیں کچھ نہیں کہتی۔ فقط پکڑتی ہے اور گھر تک چھوڑ آتی ہے۔"

دوسرا واقعہ یکم جنوری کو پیش آیا۔ یکم جنوری جاپان میں قومی تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس روز لوگ جوق در جوق عبادت گاہوں میں جاتے ہیں۔ ہم ایک رفیقِ کار کے ساتھ ایک بہت بڑی Shrine میں گئے۔ تماشا کرتے پھرتے تھے کہ ایک بڑے میاں نے ہمیں آدبوچا۔ بڑی ملائمت سے کچھ فرمایا ہم نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر کچھ فرمایا۔ ہم نے پھر نفی میں جواب دیا۔ بیس منٹ تک وہ بڑے میاں ہم سے اُلجھے رہے اور برابر بیس منٹ تک اُن کے صاحبزادے برابر میں کھڑے ہم سے معذرت کرتے رہے کہ "ابا حضور نشے میں ہیں اس لئے



معافی چاہتا ہوں۔"

نئے سال کا خیر مقدم بڑے جوش و خروش سے کیا جاتا ہے۔ ۳۱ر دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی رات کو یہ لوگ خوب پیتے ہیں۔ رات بھر جاگتے ہیں اور صبح نئے سال کے سورج کو طلوع ہُوا دیکھتے ہیں۔ عبادت گاہوں میں جاتے اور گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور پھر سے اگلے برس کی معافی کے لئے زادِ راہ جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

بڑی عبادت گاہوں میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ لاکھوں لوگ۔ بوڑھے، جوان، بچے بالے، عورتیں، لڑکیاں، سب آتے ہیں۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ بُتوں کو نذرانہ بھی پیش کرتے ہیں لیکن ـــــ مہنگائی کے اس زمانہ میں ـــــ توبہ! توبہ!! لوگ خدا کو تو کیا ـــــ بُتوں کو بھی ـــــ بھول گئے ہیں ـــــ!

ہم اس کونہ میں کھڑے تھے جہاں نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ لوگ آتے، پیسے پھینکتے، تالی بجاتے اور ہاتھ جوڑ کر نمسکار کے انداز میں سلام کرتے۔ ہمارے سامنے سکّوں کا ڈھیر تھا۔ زیادہ تر سکّے ایک یَن کے تھے۔ (ہمارے روپے میں تیس یَن ہوتے ہیں) کچھ سَو سَو یَن کے سکّے بھی تھے۔ اِکّا دُکّا نوٹ بھی نظر آتے تھے۔ ایک صاحب بڑے خشوع و خضوع سے آئے، بٹوا کھولا، ایک ہزار یَن کا نوٹ نکالا، پھینکنے سے پہلے کچھ سوچنے لگے پھر وہ نوٹ بٹوے میں رکھا اور پانچسو

ین کا نوٹ نکالا، کچھ دیر متذبذب رہے، پھر بادلِ ناخواستہ نذرخانہ میں پھینک
دیا۔ تالی بجائی، ہاتھ جوڑے اور چلے گئے۔ لیکن دُور تک پیچھے مُڑ مُڑ کر اپنا
پانچسوین کا نوٹ دیکھتے رہے۔

ہمارے وہاں ہوتے ہوئے ہزاروں لوگ نذر پھینکنے آئے لیکن سب کے
چہرے سپاٹ اور تاثرات سے خالی سوائے چند بوڑھوں کے جو الگنی پر ڈال
رکھنے کے لائق تھے۔ جاپانیوں نے مذہب کو نہایت احترام سے اُسی طرح
طاقِ نسیان پر سجا رکھا ہے جس طرح ہم لوگ گھروں میں قرآن شریف کو سجا کر
رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود درگاہوں پر چڑھاوا چڑھانے میں بڑھ چڑھ کر
حصہ لیتے ہیں۔ یعنی بڑھتے اپنے پاؤں سے ہیں اور چڑھتے دوسروں کے کندھوں
پر ہیں۔ کیونکہ اپنے کندھوں پر ہم نے مذہب کا جنازہ اُٹھا رکھا ہے۔ کلمۂ
شہادت !!

○



## ۳

پہلے پہل آئے تو ہماری بیگم کو ہمسائے کی بیگمات سے ملاقات کا شوق
چرایا۔ فارسی صاحب سے پُوچھا معلوم ہُوا اٹھارہ برس سے رنڈوے ہیں اس کے
بعد شادی نہیں کی۔ آل اولاد کوئی نہیں۔ تنہا ہیں۔ "جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا"
خوب کماتے ہیں خوب کھاتے ہیں۔ گھر کیا ہے نگار خانہ ہے۔ ہر کمرہ میں پیانو موجود
ہے۔ موسیقی سے شغف ہے۔ صاحبِ ذوق ہیں ——— بہت اچھے ہمسائے
ہیں خلیق، ہمدرد، ملنسار۔ ہم نے اُنہیں دعوت پر بُلایا۔ تشریف لائے تو ہاتھ
میں خوبصورت پھولوں کا گملہ اُٹھائے تشریف لائے کہ انہیں کمرہ میں رکھیے گا
باہر دُھوپ میں مُرجھا جائیں گے ——— پھولوں سے انہیں خوب محبت ہے۔ گھر
کے باغیچہ میں قسما قسم کے پھول اُگا رکھے ہیں۔ ہمارے بچوں نے ہاکی کھیل کھیل کر
باغیچہ کا حُلیہ بگاڑ دیا۔ فارسی صاحب خاموش دیکھتے رہے۔ ایک روز باہر سے

آئے تو لیٹر بکس میں ایک پرچہ پڑا تھا۔ لکھا تھا:۔۔۔

"پیارے بچو! میری سیڑھیوں کے پاس تمہارے لئے ایک
ناچیز سا تحفہ پڑا ہوا ہے۔ قبول کرو۔۔۔ اے ایف"

دیکھا تو نفیس بیڈمنٹن سیٹ تھا۔ اشارہ یہ تھا کہ ہاکی نہ کھیلو، لان کی صورت بگڑ گئی ہے۔ بچوں نے بہت پسند کیا۔ بیڈمنٹن کھیلنے لگے۔

ایک روز کیا دیکھا فارسی صاحب کدال اٹھائے گھر کے پیچھے والا لان صاف کر رہے ہیں۔ فرمایا "مَیں نے سوچا آپکے بچوں کے لئے ہاکی کا میدان تیار کر دوں۔" بچے بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ میدان تیار ہو گیا۔ کچھ دیر بچوں کو شوق رہا جب سکول میں جانے لگے تو بیڈمنٹن رہا نہ ہاکی، رہے نام اللہ کا۔۔۔!

گھر میں پلاؤ پکا ہوا تھا، بیگم نے کہا فارسی صاحب کو بھی چکھائیں۔ چنانچہ چکھایا اور معذرت کی کہ اِس میں ہم نے جان بُوجھ کر مصالحے کم ڈالے ہیں شاید آپکے لئے مُضر ہوں۔ فرمایا "مَیں تو چٹپٹی اور مصالحہ دار چیزیں پسند کرتا ہوں۔"

کچھ دنوں بعد حضرت نے کوریا کی "کم چی" یعنی چٹنی مرحمت فرمائی، ساتھ ہی پرچہ پر جلی حروف میں سُرخ پنسل سے لکھا ہوا تھا "احتیاط۔ بہت مرچیں ہیں۔" ہم نے سوچا ہم پاکستانی ہیں، آخر کوریا والے کتنی مرچیں کھاتے ہوں گے؟ چکھی تو تالُو جل گیا۔ الامان والحفیظ! مرچوں کے معاملہ میں یہ کوریا والے تو ہم سے میلوں آگے ہیں ؏



"وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے"

پروفیسر چن سے عرض کی کہ ہماری بیگم آپ کی بیگم سے ملنا چاہتی ہیں۔ فرمایا "وہ چینی کے علاوہ اَور کسی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتیں۔ لہذا ملاقات بے کار ہے۔۔۔"

ذکر فارسی صاحب کا تھا۔ ایک روز صبح سویرے باہر کی گھنٹی بجی۔ گئے تو دیکھا باہر ٹرک کھڑا ہے اور ایک اجنبی سے بزرگ ہیں۔ کہنے لگے "وہ آپ کا مال ہے کہاں اُتاروں؟"

"کون سا مال؟ ہم نے تو کچھ نہیں منگایا۔"

"حد ہو گئی۔ ہر مہینے تو آپ منگاتے ہیں اور ٹرک بھر کر منگاتے ہیں۔"

"بھئی ہم نے نہیں منگایا۔۔۔ مگر یہ ہے کیا بلا؟"

"شراب ہے اَور کیا ہے؟"

ہم سمجھ گئے۔۔۔ فارسی صاحب کا دروازہ جا کھٹکھٹایا اور کہا "آپ کا مال آ گیا ہے۔"

ٹرک کا ٹرک اُتارا گیا۔ فارسی صاحب فرمانے لگے "مَیں اکٹھی خرید لیتا ہوں بار بار کی زحمت سے بچنے کے لئے۔۔۔ اب تیس ۳۰ دن کے لئے چھُٹی ہو گئی۔ مَیں معافی چاہتا ہوں کہ اِس ٹرک والے نے آپ کو پریشان کیا۔ کوئی نیا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

اور کل ایک اَور خوشگوار سا لطیفہ ہوُا۔ بنک کا خط ملا۔ لکھا تھا "آپ کے اکاوٗنٹ میں اب پچاس ملین یَن جمع ہو گئے ہیں ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔"

ہم نے حیرت سے دیکھا ——— "پچاس ملین"؟ لکھ پتی تو ہم تھے ہی ین کے حساب سے لیکن ............ پچاس ملین ین کہاں سے آ گئے؟ معلوم ہوُا یہ خط بھی فارسی صاحب کا تھا اور ہرکارہ غلطی سے ہمارے لیٹر بکس میں ڈال گیا تھا۔

"یَن ——— " خوب سکّہ ہے۔ ہمارے روپے میں تیس ین ہوتے ہیں یعنی تین ٹیڈی پیسوں کا ایک یَن بنتا ہے۔ جاپان والے اِسی سکّہ میں حساب کتاب رکھتے ہیں۔ اِس لئے ہر شخص ہزاروں میں تنخواہ لیتا ہے یا لاکھوں میں۔ ہمیں جب اوسا کا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز کی طرف سے خط ملا کہ آپ کو ۲½ لاکھ ین تنخواہ دی جائے گی تو ہم سکتہ میں آ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ سکتہ کم ہوتا گیا اور یہاں یہ حال ہے کہ کوئی چیز سَو ین سے کم کی نہیں ملتی سوائے ماچس کے جو دَس ین کی ہے مگر ہوٹلوں سے مفت ملتی ہے بشرطیکہ آپ وہاں چائے پئیں اور چائے کی پیالی کی قیمت دو سَو ین یعنی تقریباً چھ روپے چھ آنے ہے۔

شروع شروع میں ہر چیز کی قیمت کو روپوں میں گنتے تھے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یَن میں حساب کرنے لگے تو گھبراہٹ کم ہو گئی۔ چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں کیونکہ جاپان کے پاس سوائے کارخانوں کے اَور کوئی چیز نہیں ہے۔ کاریں یہ لوگ بناتے ہیں، لوہا امریکہ سے آتا ہے۔



بجلی کا سامان ایک سے ایک اعلیٰ بناتے ہیں مگر میٹریل باہر سے آتا ہے۔ حتّٰی کہ گوشت بھی آسٹریلیا سے آتا ہے۔ کچھ قیمتوں کا بیان ہو جائے تو شاید آپ جان سکیں (روپے میں) :-

## گوشت :

| | |
|---|---|
| مرغی کا گوشت | ۵۰/- روپے کلو |
| بکرے کا گوشت | ۶۵/- " " |
| گائے کا گوشت | ۴۰۰/- " " |
| اور سُوّر کا گوشت | ۲۰۰/- " " (آخر سُوّر ہے نا) |
| مچھلی | ۵۰/- روپے کی ایک۔ قریباً ½ کلو وزن کی۔ |
| جھینگا مچھلی | بہت سستی |
| کیکڑا | بہت مہنگا |

## سبزیاں :

| | |
|---|---|
| آلو | دس روپے کلو |
| گوبھی | دس روپے کلو |
| بینگن | بیس روپے کلو۔ مگر گن کر بیچے جاتے ہیں |
| مٹر | تین روپے کے چھٹانک بھر |
| مُولی | تقریباً تین روپے کی ایک۔ گن کر بکتی ہے |

ادرک — بہت سستا یعنی بہت ہی سستا

ٹماٹر — تقریباً چار روپے کا ایک عدد

## پھل:

کیلا — تقریباً ایک روپے کا ایک۔ تول کر بیچتے ہیں

سنگترہ — " بارہ آنے کا " "

سیب معمولی — ۲½ روپے تین روپے کا ایک

سیب اچھا — ۵/- سے ۶/- روپے کا ایک

سیب اعلیٰ — قیمت بھی اعلیٰ وعلیٰ ہذا القیاس

پرسیمن — پاکستانی قیمت کے برابر تقریباً یعنی سستا

اناس — کافی سستا۔ تقریباً چھ روپے کا ایک

تربوز — پچاس روپے کا ایک

خربوزہ — پچیس روپے کا ایک

ناشپاتی — بیس روپے کی ایک

انگور — رہنے دیجئے اکھٹے ہیں۔ تقریباً ۲۰۰/- روپے کا گچھا

## دیگر اشیائے خورونوش:

آٹا — تقریباً ۲۰۰/- روپے من

چاول موٹے — دس روپے سیر



چاول زیادہ موٹے — پندرہ روپے سیر

اور " بہت ہی موٹے — بیس روپے سیر

چاول یہاں کی خاص پیداوار ہے لہٰذا عام ہے اور سستا۔ عام لوگوں کی غذا بھی یہی ہے۔ چاول اور مچھلی۔

دالیں — شرفا یہاں نہیں کھاتے۔

ملتی ہر چیز ہے صرف قیمت کا فرق ہے۔

## بجلی کا سامان:

چھوٹا ہیٹر — تقریباً تیس روپے

روم ہیٹر — سو روپے سے بیس ہزار روپے تک

مٹی کے تیل کا ہیٹر — چار سو سے بیس ہزار تک

گیس ہیٹر — ایضاً۔ ایضاً

واشنگ مشین — چار سو سے ہزار روپے تک

گیس اور بجلی کا ہیٹر نہ لیجئے گا کیونکہ بجلی بہت مہنگی ہے اور گیس اس سے بھی مہنگی۔ ابھی اس مہینہ میں ہمارا گیس کا بل تیس ہزار چھ سو ین کا آیا ہے یعنی کوئی ایک ہزار روپے۔

## موٹر کاریں:

بیس سال پرانی موٹر کار — تقریباً سائیکل کے برابر قیمت

| | |
|---|---|
| دس سال پُرانی موٹر کار | موٹر سائیکل کی قیمت کے برابر |
| نئی کار | نئی کار کے برابر |

جو موٹریں اور بجلی کا سامان باہر بھیجا جاتا ہے اس پر حکومت کی طرف سے ٹیکس کم ہوتا ہے لہذا یہاں سے سستی ملتی ہیں۔ مختلف مُلکوں میں جا کر مہنگی ہو جاتی ہیں۔ ٹیوٹا کا نیا ماڈل ہم نے کل ہی دیکھا ہے پینتیس ہزار روپے کا ہے۔

جاپان میں سب سے مہنگی چیز مکان ہے —— مکان کا کرایہ —— توبہ توبہ —— غالبؔ والا مضمون ہے کہ ؏

"ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا؟"

بڑے بڑے شہروں میں تو شرفا کا رہنا دشوار ہے۔ دُور دُور رہتے ہیں اور تیز رفتار گاڑیوں سے اپنے اپنے کاموں پر بر وقت پہنچ جاتے ہیں۔ جس شخص کے پاس ایک کمرہ کا مکان بھی ہے وہ غنی ہے —— ہمیں تو یہ مکان یونیورسٹی نے دے رکھا ہے اِس لئے چین کی بنسری بجاتے ہیں ورنہ کرایہ پر لینا پڑتا تو اِس وقت یہ سفر نامہ نہ لکھ رہے ہوتے واپس پاکستان آ گئے ہوتے۔

کچھ چیزیں سستی بھی ہیں مثلاً سکول، بچوں کے سکول میں پڑھائی لازمی اور مُفت ہے۔ دوپہر کا کھانا بھی کھلاتے ہیں اور اس کی واجبی سی یعنی معمولی سی قیمت وصول کرتے ہیں مثلاً ۶۰ یا ۷۰ روپے ماہانہ۔

کم سے کم اُجرت دو ہزار روپیہ ماہانہ ہے۔ اِس سے کم کسی کو نہیں ملتے یعنی



کام کرنے والوں کو —— اِس نرخنامہ کے بعد مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے آپ کو سرحد پار لئے چلتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد دین صاحب اوکایاما (OKAYAMA) سے آئے ہوئے تھے اور ہم اُنہیں اوساکا کی سَیر کراتے پھر رہے تھے کہ یکایک سامنے ایک سردار جی نظر آئے ہم نے آنکھیں مَل کر دوبارہ دیکھا واقعی سردار جی تھے۔ ڈاکٹر احمد دین صاحب نے ٹھیٹھ پنجابی میں انہیں مخاطب کیا:

"سردار جی کی حال اے؟"

—— سردار جی نے انگریزی میں فرمایا:

"معاف کیجئے مجھے پنجابی نہیں آتی —— مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

یہ سردار جی شاید بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔ اسکے بعد بہت سے سرداروں سے ملاقات ہوئی۔ پاکستانی تو صرف ایک یا دو خاندان ہیں۔ ہماری ملاقات صرف ایک خاندان سے ہے یعنی عدنان صاحب سے —— عدنان صاحب کا پتہ ربوہ کے ایک مہربان نے دیا تھا۔ ہم نے یہاں پہنچتے ہی ایک خط اُن کے پتہ پر لکھ دیا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں اور آپ سے ملنے کے مشتاق —— چار روز بعد اُن کے سیکرٹری کا خط آیا کہ عدنان صاحب تو ایران اور پاکستان کے دَورہ پر گئے ہوئے ہیں البتہ ٹیلیفون نمبر بھیج رہا ہوں

اِس پر اُن کی بیگم سے بات کرلیں ــــــ !" ہم نے اُن کے گھر ٹیلیفون کیا تو خالص جاپانی زبان میں جواب آیا۔ ہم نے انگریزی میں اپنا تعارف کروایا تو مسز عدنان اُردو پر اُتر آئیں ــــــ بہت خوشی ہوئی ــــــ چند دن بعد ہی ہم کو بے اُن کے گھر چلے گئے۔ وہی پنجاب کی روایتی مہمان نوازی ــــــ بے تکلفی اور خلوص ؎

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اس کے بعد تو یہ حالت ہے کہ ہمیں کوئی دقت ہو ہم انہیں فون کر دیتے ہیں اور مناسب راہنمائی بھی مل جاتی ہے اور اپنی زبان بولنے اور سمجھنے والے مستزاد۔

کچھ دنوں بعد عدنان صاحب دَورہ سے لَوٹے تو خود ہمیں ٹیلیفون کیا۔ میل ملاقات بڑھی تو معلوم ہوا خلوص اور محبّت میں جاپانیوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ !!

ایک روز کتابوں کی ایک دکان میں ایک ساڑھی پوش خاتون نظر آئیں ہم نے رُک کر اُنہیں غور سے دیکھا وہ بھی رُک گئیں اور ہمیں دیکھنے لگیں ــــــ تعارف پر معلوم ہوا کہ ہندوستان کے علاقہ احمد آباد کی ہیں۔ میاں بیوی دونوں یہاں کام کرتے ہیں اور جاپانی سیکھتے ہیں۔ ایک بار پھر ان سے ملاقات ہوئی۔



اُن کے میاں ہمیں دیکھ کر ٹھٹک گئے اور ہم انہیں دیکھ کر ــــــ دونوں کی داڑھیاں ایک جیسی تھیں! ہاماگوچی صاحب کہنے لگے "مسلمان معلوم ہوتا ہے"۔ ہم نے کہا "اِس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا"۔

کہنے لگے ــــــ "کیوں؟"

ہم نے عرض کیا کہ "احمد آباد کے مسلمانوں کا ناک نقشہ اَور ہوتا ہے ــــــ"

کہنے لگے ــــــ "کیسے؟"

ہم نے بتایا کہ ــــــ "ہندوستان میں احمد آباد ایسی جگہ ہے جہاں ۴۷ء سے لے کر اب تک ہندو مسلم فساد بہت ہوتے رہے ہیں اور روز روز کے فساد نے مسلمانوں کا حُلیہ بگاڑ دیا ہے ــــــ"

ہاماگوچی صاحب ہنسے اور فرمایا ــــــ "یہ دلیل تو ہمارے حق میں جاتی ہے ــــــ یہ حضرات شاید اِسی لئے ہندوستان سے بھاگ کر جاپان آ گئے ہیں"

اور ہم خاموش ہو گئے کیونکہ دلیل خاصی معقول تھی ــــــ

ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز نے ہمیں ٹوکیو آنے کی دعوت دی تو ہم نے جھٹ سے قبول کر لی ــــــ

ماتویہ صاحب نے کہا۔ صاحب! صبح چھ بجے کی گاڑی سے چلیں گے اِس لئے گھر سے ساڑھے چار بجے چلئے تاکہ پَونے چھ بجے گاڑی پر سوار ہونے والی قطار میں جگہ مل سکے۔ ساڑھے چار بجے؟ ــــــ یعنی ساڑھے چار بجے۔ حد ہو گئی۔ اتنی

صبح اُٹھنا اور پھر جنوری کے مہینہ میں اور پھر اوساکا میں - دل پر پتھر رکھ کر حامی بھر لی کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ راشد صاحب کو فون کیا کہ حضرت! ہم پہلی ہکاری سے ٹوکیو پہنچ رہے ہیں لہذا اگر وقت ہو تو سٹیشن پر تشریف لے آئیں اور ہمارے ساتھ ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں چلیں۔

سرِ شام مُنہ لپیٹ کر پڑ رہے کہ صبح ساڑھے چار بجے ٹوکیو کے لئے روانہ ہونا ہے۔ سات —— آٹھ —— نَو —— دس —— خدا معلوم نیند کیوں نہیں آ رہی تھی۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر سُلا دیا —— گیارہ —— حساب کی کتاب اُٹھائی —— بارہ —— تنگ آ کر سونے کا ارادہ ترک کر دیا کہ جس شخص کو "حساب" کرتے ہوئے بھی نیند نہ آئے اُس کے اندر ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ ارادہ توڑ دیا تو غنودگی سی ہونے لگی اور پھر ہم گہری نیند سو گئے۔ تین بجے الارم نے جگا دیا۔ اُٹھے، شیو کی، چائے پی اور اوساکا کی سردی سے بھڑنے کے لئے تیار ہونے لگے۔ ایک سویٹر —— دوسرا —— تیسرا —— چوتھا —— جیکٹ —— کوٹ —— اوورکوٹ —— مفلر —— دستانے —— جو کچھ میسّر تھا پہن لیا۔ جلّ تُو جلال تُو پڑھتے ہوئے دروازہ سے باہر قدم رکھا۔ ٹھنڈی ہوا نے سیدھا ناک پر وار کیا۔ ناک بہنے لگی اور پھر بہتی ہی چلی گئی۔

قریب کے زمین دوز سٹیشن پر پہنچے۔ تالا پڑا ہوا تھا۔ ("تالا" گیا۔ سالک مرحوم



کے لفظوں میں "اللہ تالا" تھا) معلوم ہوا کہ گاڑیاں صبح ساڑھے پانچ بجے شروع ہوتی ہیں لہذا ٹیکسی پکڑی اور شِن اوساکا کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ شِن اوساکا —— اوساکا کا وہ سٹیشن ہے جہاں سے ہکاری چلتی ہے۔

ہکاری یعنی شِن کان سین۔ یہ دُنیا کی سب سے زیادہ تیز رفتار گاڑی ہے۔ "شِن" جاپانی زبان میں نئی چیز کو کہتے ہیں۔ سین لائن کو کہتے ہیں اور کان غالباً کان کو کہتے ہوں گے۔ اس کی رفتار ۲۰۰ سے ۲۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اس لئے اسے BULLET TRAIN بھی کہتے ہیں یعنی گولی کی طرح چلنے والی گاڑی۔

ٹکٹ لیا۔ ریزرویشن کروائی۔ معلوم ہوا کہ بوگی ۸ میں تیئیسویں سیٹ ہماری ہے اور واپسی پر رات سات بجے کی گاڑی میں بوگی ۶ میں تیسری سیٹ ہماری ہے۔ اس سارے کام میں صرف دو منٹ صرف ہوئے۔ ٹکٹ انسان دیتے ہیں ریزرویشن کمپیوٹر کرتا ہے۔ ہم اطمینان سے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ ماتویہ صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے حالانکہ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ ہم سے پہلے پہنچیں گے۔ گاڑی سامنے کھڑی تھی لیکن دروازے بند تھے۔ چھ بجنے میں پانچ منٹ تھے دیکھا کہ ماتویہ صاحب ہنستے مسکراتے اطمینان سے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے کہا "آپ کو تو پونے چھ بجے ۶ کا تھا؟" فرمایا "ہاں ذرا دیر ہو گئی مگر گاڑی چلنے میں تو ابھی پانچ منٹ باقی ہیں۔ میں سب وے سے آیا ہوں۔ پہلی گاڑی نکل گئی دوسری لینی پڑی۔ اور آپ؟" ہم نے بتایا کہ ہم

ٹوکیو سے آئے ہیں کیونکہ سب وے تو ساڑھے پانچ بجے شروع ہوتی ہے۔

"دیکھ لیجئے! میں ۳۵-۵ پر چلا تھا اور اب آپ کے پاس کھڑا ہوں۔"

اتنے میں گاڑی کے دروازے کھُل گئے اور ہم اپنی سیٹ پر پہنچ گئے۔

تیس سیکنڈ پہلے الارم ہوُا، دروازے بند ہوئے اور گاڑی رینگنے لگی۔

ساری کی ساری گاڑی ایئرکنڈیشنڈ ہے مگر ایک گرین کار بھی ہے جو شاید زیادہ ایئرکنڈیشنڈ ہوتی ہے کیونکہ اس کا کرایہ عام کرایہ سے تقریباً دُگنا ہے۔

گاڑی چلی تو اعلان کیا گیا "ہم آپ کو ہکاری ۲۱ پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ نے کرم فرمائی کی کہ اِس گاڑی سے سفر کرکے ہمیں خدمت کا موقعہ دیا مگر ہم بڑے افسوس سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ گاڑی اپنے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ اور پینتیس منٹ دیر سے ٹوکیو پہنچے گی کیونکہ راستہ میں کیوتو سے ناگویا تک شدید برف باری ہو رہی ہے اور ریلوے لائن پر برف پڑی ہوئی ہے۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا کہ "ابھی سے انہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ گاڑی اتنی دیر سے پہنچے گی؟"

جواب ملا۔ گاڑی میں خودکار برقی آلات موجود ہیں جو اس کی ہر حرکت کو کنٹرول کرتے ہیں لہذا منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب کر لیتے ہیں۔ سپیڈ بھی ان کے کنٹرول میں ہے۔ بجلی بھی اور ہر چیز۔ لائن خراب ہو تو سپیڈ خود بخود ہلکی



ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر زلزلہ آجائے تو گاڑی خود بخود رُک جاتی ہے۔ گاڑی کے اندر ٹیلیفون بھی لگا ہوُا ہے جہاں جی چاہے کیجئے مگر جاپان کے اندر۔

ہمارا اِس گاڑی پر پہلا باقاعدہ سفر تھا اِس لئے ہم کچھ زیادہ ہی مشتاق تھے۔ ماکو یہ صاحب تو کچھ دیر بعد سو گئے اور ہم کھڑکی سے باہر نظریں لگائے ہر چیز کو پیچھے کی طرف اُڑتا ہوُا دیکھنے لگے۔ پندرہ بیس منٹ بعد گاڑی ایک سرنگ میں داخل ہوئی اور زن سے باہر نکلی تو اس کی رفتار دھیمی ہونے لگی اور کچھ دیر بعد تو دائیں بائیں ہر طرف برف ہی برف تھی، سفید اور چمکدار۔ سُورج ٹھٹھرا ہوُا کھڑا تھا۔ ہلکی ہلکی دُھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لوگ باگ، لمبے لمبے بُوٹ پہنے، کنٹوپ چڑھائے، برف کو روندتے چلے جا رہے تھے اور ہم گرما گرم گاڑی میں بیٹھے نظارہ کر رہے تھے۔ کافی پی رہے تھے اور ہکاری والوں کو دُعائیں دے رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹہ تک گاڑی اس ہلکی رفتار سے چلتی رہی جس رفتار سے ہماری "تیز گام" یا "تیز رَو" چلتی ہے اس کے بعد اس نے ہَوا سے شرط باندھی۔ اللہ دے اور بندہ لے! ہم نے باہر کی چیزوں کو اُڑتے دیکھا تو گھبرا کر ماکو یہ صاحب سے پُوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ غالباً نیند سے چونکے تھے فرمانے لگے۔ "کوئی بات نہیں ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

پھر سرنگوں کا سلسلہ شروع ہوُا۔ سرنگ پر سرنگ۔ گاڑی زن سے داخل

ہوتی اور زن سے نکل آتی۔ ہم نے ماکویہ صاحب سے کہا کہ ان لوگوں نے اتنی چھوٹی چھوٹی اتنی سرنگیں کیوں بنا رکھی ہیں؟" فرمانے لگے "سرنگیں چھوٹی نہیں ہیں صرف گاڑی ذرا زیادہ تیز ہے ——

ایک سرنگ سے گاڑی نکلی تو کوہ فیوجی سامنے آگیا۔ کوہ فیوجی جاپان کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ چوٹی برف سے ڈھکی ہوئی، اِرد گرد سبزہ ہی سبزہ، بہار کے موسم میں سُنا ہے پھول ہی پھول ہوتے ہیں مگر اس کے دامن میں بے شمار کارخانے ہیں۔ چمنیاں، دھواں اور فیوجی —— عجیب منظر تھا۔ برف سے اَٹا ہوا یہ پہاڑ یوں لگتا ہے جیسے تھالی میں رکھا ہوا ہو۔ اِرد گرد وادی ہے اور درمیان میں پہاڑ۔ خوبصورت —— خوبصورت!

گاڑی جب زیادہ ہی تیز چلنے لگی تو ہم نے پوچھا "اس کی کیا رفتار ہوگی؟" فرمانے لگے "چلئے دیکھ لیتے ہیں" اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر بوگی ۹ کی طرف چلے۔ یہ بوگی ڈائننگ کار ہے اور ڈائننگ کار میں رفتار کا میٹر بھی لگا ہوا ہے۔ دیکھا سوئی ۲۲۵ کے قریب تھی۔ جُھر جُھری سی آگئی

اعلان ہوا اب ہم کچھ دیر بعد ٹوکیو کے سٹیشن پر پہنچنے والے ہیں۔ ٹوکیو شروع ہوا اور کافی دیر تک شروع رہا۔ یعنی ہر طرف شہر ہی شہر، انسان ہی انسان، عمارتیں ہی عمارتیں۔ ایک جگہ ایک عجیب و غریب سی گاڑی ایک عمارت کی دوسری منزل پر کھڑی تھی معلوم ہوا یہ مونو ریل ہے جو صرف ایک پٹڑی پر چلتی ہے۔



ہمارا منہ حیرت سے کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔ اِس کی رفتار بھی واجبی سی ہے یعنی کوئی سَو سوا سَو کلومیٹر فی گھنٹہ۔

ٹوکیو سٹیشن پر پہنچے اور عین ایک گھنٹہ ۲۳ منٹ دیر سے۔ راشد صاحب منتظر تھے۔ یونیورسٹی جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوئے اور پھر ایک جگہ گاڑی سے اُتر کر ٹرام کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ ٹرام۔ شاید پچھلی صدی کی یادگار تھی۔ خستہ خراب۔ چر چراتی چلی جاتی تھی۔ یونیورسٹی پہنچے۔ شعبۂ اُردو کے صدر منتظر تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ حضرت دس بجے ہمارا کوئی لیکچر بھی کروانا چاہتے تھے جو برف کی نذر ہو گیا۔ ہم نے کہا خوب رہی۔ اگر ہکاری دیر سے نہ پہنچتی تو ہم یہاں لیکچر دے رہے ہوتے، صاف بچ گئے۔

ماکویہ صاحب تو ہفتہ میں ایک دن اِس یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لئے باقاعدہ آتے ہیں۔ ہم بال بال بچ گئے مگر سوزوکی صاحب جو اُردو کے پروفیسر ہیں کہاں چُوکنے والے تھے شعبہ کے سب اساتذہ کو اکٹھا کر لائے۔ ان حضرات سے ملاقات ہوئی۔ وسیع و عریض لائبریری دکھائی۔ داخل ہوئے تو سامنے جوش صاحب کی "یادوں کی بارات" پڑی تھی معلوم ہوا اس کا آخری باب یہاں بہت مقبول ہے اور ایک طالب علم ایم۔ اے کے مقالہ کے طور پر اس باب کا جاپانی زبان میں ترجمہ کر رہا ہے۔

شعبۂ ہندی کے کمرہ میں داخل ہوئے تو دیکھا منیر نیازی بیٹھے ہیں۔ ہم

اخاہ کہہ کر لپٹنے ہی والے تھے کہ سوزوکی صاحب نے تعارف کروایا۔ یہ تناکا صاحب ہیں —— ہوبہو منیر نیازی —— ایک دو بار ہم نے انہیں چھو کر بھی دیکھا۔

ع "ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا" والا مس نہیں تھا۔

پروفیسر کورایاناگی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اردو کے صدر شعبہ ہیں۔ عالم فاضل، بڑی بے نیازی سے سگریٹ پیتے ہیں۔ ابھی ابھی لندن، پیرس، بیروت اور تہران سے لوٹے تھے۔ شاید اسی سحر میں تھے۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے زبان دان ہیں اور صاحب واقعی زبان دان ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کا معائنہ بھی فرما چکے ہیں۔ مجھ سے پوچھا "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

بتایا "ربوہ سے!"

"ربوہ سے —— کیا آپ احمدی ہیں؟"

"جی۔ بحمداللہ!"

"آپ کی جماعت تو تبلیغِ اسلام کی وجہ سے مشہور ہے۔"

سوزوکی صاحب نے ہنس کر لقمہ دیا ——

"تبلیغ سے تو یہ یہاں بھی نہیں چوکے۔ جماعتِ احمدیہ کے مبلغ ان کے ساتھ ہیں۔"

ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز سے فارغ ہوئے تو "احمدیہ مشن ہاؤس" میں حاضری دی اور پھر راشد صاحب نے ازراہِ مسافر پروری ہمیں ٹوکیو سٹیشن



پر پہنچایا۔

عین سات بجے ہکاری نے روانہ ہوئی اور اوساکا کے لئے واپسی کا سفر شروع ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ "یہ گاڑی پینتیس منٹ اور چھ سیکنڈ لیٹ پہنچے گی۔" ہم نے کتاب نکال کر پڑھنا شروع کی۔ بھوک لگنا شروع ہوئی تو ڈائننگ کار میں گئے۔ اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کسی اوّل درجہ کے ریستوران میں آ گئے ہیں۔ وہی صاف ستھری فضا —— نکھرا نکھرا ماحول، مدھم مدھم روشنی، مینو دیکھا۔ "مسلمان" کھانا منگوایا۔ بہت ہی لذیذ اور مزیدار۔ کھانا کھاتے رہے، کتاب پڑھتے رہے، اس کے بعد کافی پی۔ واپس اپنی سیٹ پر پہنچے ہی تھے کہ اعلان ہوا "معاف کیجئے! گاڑی مزید لیٹ ہو جائے گی کیونکہ باہر برف پڑنا شروع ہو گئی ہے اوساکا انتالیس منٹ دیر سے پہنچیں گے"۔ یعنی اگلے وقت سے کوئی ساڑھے تین منٹ زیادہ۔

اوساکا پہنچے تو اگلی سیٹ پر جو جوڑا تشریف فرما تھا وہ بھی ہمارے ساتھ ہی اترا۔ ہم سب وے میں سوار ہوئے تو وہ بھی ہمارے ساتھ رہے۔ قریب کے سٹیشن پر اترے تو وہ پیچھے پیچھے —— گھر کی طرف چلے تو پھر وہ برابر موجود —— اپنے گھر میں داخل ہوئے تو مڑ کر دیکھا کہ کہیں وہ ہمارے گھر میں تو نہیں آ گھسیں گے مگر وہ تیسرے مکان میں داخل ہو رہے تھے۔ حد ہو گئی ہم تو تین ماہ سے یہاں رہتے ہیں ابھی تک ان سے شناسائی نہیں ہوئی۔ پھر یہ سوچ کر

تسلّی ہوگئی لوگ برسوں ایک ہی محلّہ میں دیوار بہ دیوار رہتے ہیں مگر ایک دوسرے کو نہیں جانتے اور ہمیں تو صرف تین مہینہ ہی ہوئے ہیں۔ اور پھر ہمارے دوسرے ہمسائے پروفیسر چِن بھی تو ہیں جو ہمارے ہی مکان کے اوپر رہتے ہیں، اُن سے بھی تو ہماری ابھی تک صرف دو مرتبہ ملاقات ہوئی ہے۔ تین مہینہ میں دو مرتبہ —— یہ نہیں کہ ہمارے تعلقات کشیدہ ہیں بات صرف یہ ہے کہ جب ہم یونیورسٹی ہوتے ہیں وہ گھر پر ہوتے ہیں اور جب ہم گھر پر ہوتے ہیں تو وہ یونیورسٹی ہوتے ہیں۔ میاں بیوی دو نفر تو ہیں۔ بوڑھے اور بزرگ، اولاد بڑی اور صاحبِ اولاد ہے، ان سے علیحدہ رہتی ہے۔ عرصہ بیس سال سے یہاں مقیم ہیں لیکن ان کی بیگم کو چینی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی۔

کوبے —— اوساکا کے نواح کا قصبہ ہے۔ "قصبہ" سے مراد ہے اس کی آبادی لائلپور سے دُگنی ہے۔ یہاں ہندوستانی بہت ہیں۔ سکھ اور ہندو۔ ساڑھیاں، تلک اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرنے کے مناظر بہت ہیں۔ ہمیں دو تین بار اپنے برِّصغیر کی شکلیں نظر آئیں تو ہم نے اُنہیں روک کر اُردو میں بات کرنا چاہی مگر وہ اُردو کم جانتے ہیں اور جاپانی زیادہ۔ مدّتوں سے یہ لوگ یہاں مقیم ہیں۔

کوبے میں مسجد بھی ہے۔ خاصی عظیم الشان —— خوبصورت —— راشد صاحب تشریف لائے تو ہم مسجد دیکھنے کے لئے گئے۔ عدنان فیملی ساتھ



تھی۔ نماز مغرب کا وقت تھا مگر تالا پڑا ہوا تھا۔ متولّی سے کہہ کر مسجد کھلوائی۔ اندر سے اور زیادہ خوبصورت تھی۔ فرش پر قالین، دیواروں پر طغرے، اونچا سا کار چوبی کا منبر، مرکزی طور پر ایئر کنڈیشنڈ۔ معلوم ہوا کہ عیدین کے موقعہ پر کھولی جاتی ہے یا کبھی کبھی جُمعہ کے روز۔ رمضان میں البتہ تراویح بھی پڑھی جاتی ہیں۔ اِس عید کے موقع پر بہت حاضری تھی کیونکہ کسی عرب مُلک کا بحری جہاز ان دنوں کوبے کی بندرگاہ میں لنگرانداز تھا وہ لوگ بھی عید کے لئے آ گئے تھے۔ عام طور پر حاضری سَو اور ایک سَو پچاس کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

یہ مسجد تُرکوں نے تعمیر کروائی تھی اغلباً اِس صدی کے آغاز میں۔ امام بھی تُرک ہیں۔ اب لیبیا کی حکومت نے فلپائن سے کچھ قُرّاء حضرات کو یہاں بھیجا ہے جو کچھ عرصہ یہاں قیام کر کے قرآن سکھائیں گے۔ اللہ تعالےٰ اُن کی کوششوں میں برکت ڈالے۔

جاپانی زبان میں اسلام کے بارہ میں کچھ بنیادی لٹریچر بھی موجود تھا امام صاحب موجود نہ تھے۔ اُن سے ملاقات کے لئے ہفتہ بھر کا نوٹس درکار تھا جو ہم چار گھنٹوں کے قیام کی وجہ سے نہیں دے سکتے تھے۔ دیکھئے شاید کبھی اُن سے بھی ملاقات ہو جائے! ویسے خادمہ مسجد —— بُدھ تھی —— اپنا گھر بار کوئی نہیں خدا کے گھر میں رہتی ہے۔ حسنؔ رضا سی مرحوم یاد آ گئے ع

"چھٹتا ہے جب سے گھر اپنا خدا کے گھر میں رہتے ہیں"

پہلے کسی بُدھ مندر کی خادمہ تھی اب مسجد کی خادمہ ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے آ گئی ہو گی کہ ؎

"اب تو جاتے ہیں بُتکدہ سے میرؔ!
پھر ملیں گے اگر خُدا لایا"

آزادیٔ صحافت کا نام تو بہت سُنا تھا یہاں آ کر معلوم ہؤا کہ آزادیٔ صحافت کس "چڑیا" کو کہتے ہیں۔ اخبارات جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ "تمہارے مُنہ میں کَے دانت ہیں اور یہ کیا دانتا کل کل لگا رکھی ہے۔

ابھی پچھلے دنوں بادشاہ سلامت کے بارہ میں تین نہایت دقیق اور جامع مضامین شائع ہوئے جن کا لبِّ لباب یہ تھا کہ اِس دَور میں آخر بادشاہ سلامت کیوں تخت پر دھرے رکھے ہیں؟ ان کا وجود باجودِ مُلک و مِلّت کے کس کام آتا ہے؟ اور پھر ان کے بعد ایک ولی عہد بھی بادشاہ بننے کا انتظار کر رہا ہے ـــــ یہ سلسلہ کب تک چلے گا ـــــ؟" وغیرہ وغیرہ

کچھ جستہ جستہ دلچسپ باتیں قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے مثلاً مضمون نگار کا ارشاد تھا کہ پچھلے دنوں بادشاہ سلامت امریکہ تشریف لے گئے تو وہاں ایک جگہ بچّوں کو پیار کیا مگر جاپانی بچّے ظلِّ سبحانی کے پیار سے محروم ہیں۔ یہاں تو اگر بادشاہ کو باہر نکلنا ہوتا ہے تو پولیس اور حفاظتی دستے عوام کا ناطقہ بند



کر دیتے ہیں ـــــ آخر کیوں؟

قبلہ گاہی ایک جگہ دَورہ پر تشریف لے گئے تو جس ہوٹل میں ٹھہرے اُس ہوٹل کے ملازمین کو ایک مہینہ پہلے سے جراثیم سے محفوظ رکھنے کے انتظامات کیے گئے۔ ہر روز اُن کا معائنہ کیا جاتا اور دوائیں دی جاتی تھیں، ہوٹل کی صفائی کے لئے بے پناہ اخراجات ہوئے کہ صفائی کروانے والوں کا صفایا ہو گیا۔ عوام پر یہ غیر ضروری بوجھ کیوں ڈالا گیا ـــــ؟"

حضور ظلِّ سبحانی اِس ضعیفی میں سال بھر میں تین ہزار خطوط پر مُہریں لگاتے ہیں، پارلیمنٹ کے بِلّوں کی توثیق کرتے ہیں اور اپنے خاص موضوع یعنی بحری حیاتیات پر اپنے تین رفقائے کار سمیت تحقیقات کرتے ہیں اور دس بارہ ملاقاتیوں کو ملاقات کا شرف بخشتے ہیں ـــــ یہ کتنا ظلم ہے کہ ایک بوڑھے شخص کو سال بھر میں اتنا کام کرنا پڑتا ہے۔ کیا بہتر نہیں کہ اب وہ آرام فرمائیں اور باقی عمر یادِ خدا میں بسر کریں؟

اور قبلہ ولی عہد اور ان کی شہزادی مچیکو سوائے اپنے بچّوں کی دیکھ بھال کے اَور کون سا کارنامہ انجام دے رہے ہیں؟

ہم نے مضمون پڑھے تو کافی پریشان ہوئے کہ یہ اخبار والے اتنی دریدہ دہنی کا مظاہرہ کر رہے ہیں کوئی تو انہیں لگام دے گا ـــــ مگر کچھ نہیں ہؤا۔

ہم نے تفنّنِ طبع کے طور پر راشد صاحب سے کہا کہ شہنشاہ کی ذات پر یہ

جو لے دے ہو رہی ہے کل کلاں یہ مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ جاپان میں زمین
کی قلت ہے اور رہائشی سہولتوں کا فقدان ہے لہذا بادشاہ سلامت جو اتنا
وسیع و عریض محل سنبھالے بیٹھے ہیں اُن سے لے لیا جائے ____ '

راشد صاحب نے فرمایا کہ کل کلاں نہیں ، یہ بحث بھی اخبارات میں مدتوں سے
چل رہی ہے بلکہ معاملہ "ڈائٹ" یعنی پارلیمنٹ تک پہنچ چکا ہے اب دیکھئے
اس بحر کی تہ سے اُچھلتا کیا ہے ؟



## ۴

جاپان میں بھی جمہوریت ہے اور لوگ جمہوریت پسند ہیں ۔ اتنے
زیادہ کہ ہر شخص کو آزادیٔ رائے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے مگر ہم نے کسی بڑے جگادھری
قسم کے سیاست دان کے منہ سے بھی عوام کا لفظ کبھی نہیں سُنا ۔ شاید ان
لوگوں کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوتی !

یہاں ایک خاتون ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۸۹۴ء کے لگ بھگ
یہ دعویٰ کیا کہ وہ مہدی ہیں اور تجدیدِ دین کے لئے بھیجی گئی ہیں ۔ آپ نے
(OOMUTU) اُوموتو فرقہ کی بنیاد رکھی ۔ جنگ و جدال کو حرام قرار دیا ۔ امن ،
آشتی اور صلح کے ساتھ رہنے کی تبلیغ کی اور یہ پیشگوئی فرمائی کہ دُنیا بہت جلد
خدائے واحد کے جھنڈے تلے جمع ہو جائے گی ۔ جاپان پر اُس وقت فوجی تسلط
تھا جنگ و جدال کے خلاف فتویٰ سُن کر وہ لوگ سیخ پا ہو گئے اور اُس فرقہ کے

لوگوں پر وہ مظالم ڈھائے کہ خدا کی پناہ! فرقہ کی بانیہ کی قبر تک اُکھاڑ پھینکی۔ مرکز کو تاخت و تاراج کر دیا گیا اور اپنی دانست میں اُنہیں نیست و نابود کر دیا گیا مگر جنگِ عظیم میں جاپان کو شکستِ فاش ہوئی اور اُن کو مٹانے والے مٹ گئے مگر اُن کا فرقہ اور اُن کا مشن اب بھی موجود ہے۔ اور جمہوریت کے اِس دَور میں بھی جاپان کے آئین میں اِس فرقہ کو بُدھ ازم سے خارج کرنے کی کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔ ہم پروفیسر کان کاگایا کی معیّت میں اس فرقہ کے مرکز ایابے (AYABE) میں گئے۔ ان کا عظیم الشان مندر دیکھا۔ لوگوں کے خلوص اور محبّت کو دیکھا اور غالب کو داد دی ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اِس فرقہ کی ذیلی تنظیم (ULBA)————

(UNIVERSAL LOVE AND BROTHERHOOD ASSOCIATION)

یعنی عالمی اخوّت و محبّت کی تنظیم کی دعوت پر ہم وہاں اسلام پر لیکچر دینے گئے تھے۔ چنانچہ پانچ چھ گھنٹے کے قیام کے دَوران ہم نے تقریباً پانچ چھ گھنٹے ہی انہیں اسلام کی تعلیم سے آگاہ کیا اور اِس طرح پہلی بار اِس قریہ میں اسلام کا نام پہنچایا۔ ربّنا تقبّل مِنّا۔

اِس فرقہ کی دوسری اماموں کی طرح ان کی تیسری امام بھی ایک خاتون



ہیں اُن سے تو ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کے شوہر جو امام کے نائب سمجھے جاتے ہیں ہمارے میزبان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سچّی توحید کو سمجھنے اور ماننے کی توفیق دے۔ آمین

میزبان محترم نے خواہش کی کہ ہم عربی حروف یعنی قرآن کی زبان میں کوئی پیغام اُنہیں لکھ کر دیں چنانچہ ہم نے برش پکڑا اور خطِ نسخ میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور کلمہ طیّبہ

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه

لکھ کر انہیں دیا جسے لے کر انہوں نے چُوما اور نہایت احترام سے رکھ لیا۔ ہم نے کاگایا صاحب سے کہا اِس کلمہ کو غور سے پڑھ لیجئے اور گواہ رہیئے کہ ہم نے کوئی تحریف نہیں کی ہے۔ . . . . . .

اتنا کچھ لکھنے کے بعد خیال آیا کہ ہمیں تو سفر نامہ لکھنا ہے یہ تبلیغی رپورٹ کا کون سا موقع ہے؟ سوچنے لگے اوکایاما کے بارہ میں لکھیں جہاں ہم ڈاکٹر احمد دین صاحب کی دعوت پر گئے تھے۔ بچّوں نے پُوچھا یہاں قابلِ دید جگہ کونسی ہے؟ فرمانے لگے "چڑیا گھر جہاں صرف دو شیر ہیں۔ مگر پہاڑ کے دامن سے پہاڑ کی چوٹی تک کیبل ٹرین چلتی ہے"۔ بچّے مچل گئے کہ ہم کیبل ٹرین میں بیٹھیں گے۔ ہمارا بھی پہلا موقع تھا لہٰذا جانے کے لئے ٹیکسی میں بیٹھے۔ اس اللہ کے بندے کو انگریزی نہیں آتی تھی ہمیں جاپانی نہیں آتی تھی کچھ اشاروں

کنایوں سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر احمد دین صاحب نے شیر کی سی آواز نکال کر اسے ڈرایا دھمکایا۔ اُس نے موٹر سٹارٹ کی اور چلنے لگا۔ ہم نے سمجھا سمجھ گیا ہو گا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جگہ موٹر روکی اور کہنے لگا "اُتریے وہ ہے۔" ہم اُترے اور وہ جلدی سے پیسے لے، موٹر سٹارٹ کر، یہ جا وہ جا۔ سامنے سرکس کا خیمہ لگا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے ایک دوست کو ٹیلیفون کر کے چڑیا گھر کا جاپانی نام پوچھا اور بار بار یاد کرتے رہے۔ بعد از خرابیٔ بسیار اس ویرانہ میں ایک ٹیکسی ملی۔ بیٹھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے وہ جاپانی لفظ اُس کے مُنہ پر دے مارا۔ اس نے سوالیہ نشان کی طرح مُنہ کھولا اور پُوچھا کہاں؟ ڈاکٹر صاحب نے پھر وہ لفظ دُہرایا مگر اُس کے پلّے نہ پڑا۔ آخر پھر وہی شیر کی آواز والی ترکیب آزمائی۔ ڈرائیور ہنسنے لگا اور انگریزی میں گویا ہوا "کیا آپ چڑیا گھر جانا چاہتے ہیں؟ چنانچہ اُس نے ہمیں چڑیا گھر پہنچایا۔ اور ہم نے بجائے چڑیا گھر کے دو شیر دیکھنے کے کیبل ٹرین پر سواری کی۔ پہاڑ کی چوٹی سے سارا اوکیاما شہر نظر آتا تھا لہٰذا اس سفر کے ساتھ سارے اوکیاما کی سَیر بھی ہو گئی۔ واپس آئے اور شن کان سین یعنی بُلٹ ٹرین سے ۲۴۰ کلومیٹر کا فاصلہ ایک گھنٹہ پانچ منٹ میں طے کر کے واپس اوساکا پہنچ گئے۔ لَوٹ کے بُدھو گھر کو آئے۔



دِل نے کہا مضمون کو اِس بُدھو قسم کے محاورہ پر ختم کرنا مناسب نہیں کچھ اَور لکھنا چاہیئے۔ چنانچہ ذہن فوراً کاشکو جیما کی طرف پلٹا جہاں ہم پروفیسر ہاما گوچی، اُن کی بیگم اور اُن کے دو بچوں کے ساتھ گئے تھے۔ کاش کو جی ما۔ ع

اِک تیر مرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اتنی خوبصورت جگہ کہ دوبارہ جانے کو جی چاہتا ہے۔ اوساکا کے جنوب مشرق میں کوئی دو سَو کلومیٹر کے فاصلہ پر آبنائے کاشکو جیما ہے! گاڑی خوبصورت مناظر اور خوبصورت شہروں، قصبوں اور گاؤں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی زمین کے آخری کنارے تک پہنچ گئی۔ آگے سمندر ہی سمندر تھا!

آبنائے کاشکو جیما موتیوں کی افزائش کے لئے مشہور ہے چنانچہ جاپان کا بلکہ دُنیا کا سب سے بڑا موتیوں کا کارخانہ میکی موتو یہیں ہے۔ یہیں سمندر سے گھونگھے اور سیپیاں نکالی جاتی ہیں، موتی نکالے جاتے ہیں اور یہ خوبصورت مقام بجائے خود ایک ایسا موتی معلوم ہوتا ہے جو عروسِ فطرت کے آویزہ میں آویزاں ہو!

خوبصورت پہاڑ، سبزہ ہی سبزہ، پھُول ہی پھُول، ندی نالے، آبشار، ڈھلوانیں اور ڈھلوانوں پر بنے ہوئے رنگ برنگے خوبصورت خوبصورت مکان۔ قدرت نے اپنا حُسن بڑی فیّاضی سے اِس خطّۂ زمین کو ودیعت کیا ہے۔

گاڑی اوساکا سے چلی تو سیدھی توبہ کے مقام پر آ کر رُکی۔ توبہ اپنے نام کے برعکس بڑی توبہ شکن جگہ ہے۔ اس کا نام تو، توبہ توبہ ہونا چاہیئے تھا۔ سمندر خشکی میں بہت دُور تک اندر آگیا ہے اور ارد گرد بے پناہ خوبصورت اور سرسبز پہاڑ ہیں۔ وادی میں وادی کم اور سمندر زیادہ ہے۔ گہرے نیلے پانی پر سُورج کی کرنیں اور سبزہ کا عکس پڑتا ہے تو ایک ایسا رنگ پیدا ہوتا ہے جسے صرف نقّاشِ فطرت ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ہم اس مقام سے گزر کر منزلِ مقصود پر پہنچے۔ گاڑی سے اُتر کر لانچ میں بیٹھے اور ارد گرد کے سات مُنّے مُنّے جزیروں کی سیر کی۔ ایک جزیرہ تو اتنا چھوٹا ہے کہ اس پر صرف دو درخت ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ دو درخت ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے ہیں۔ اپنے دوست بزرگوارم ڈاکٹر سیّد صفدر حسین D.P.I پنجاب بہت یاد آئے ؎

شجر کھڑے ہیں جو باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے
کسی کی یاد میں، ہم بھی ہیں دل سنبھالے ہوئے

ایک جزیرہ کے قریب لانچ والے نے اُتار دیا کہ میکی موتو پرلز کا سٹال دیکھئے! اُترے، گھونگے اور سیپیوں میں سے موتی نکالنے کا تماشا دیکھا۔ سیپ کے بنے ہوئے ایک دو بروچ خریدے، واپس کاشکوجیما پہنچے اور سب سے بڑے ہوٹل کے سامنے بیٹھ کر اپنا ٹفن بکس کھول لیا۔ اس ہوٹل میں ایک بار



بادشاہ سلامت تشریف لائے تھے اُس وقت سے اس ہوٹل کے اخراجات بھی اتنے زیادہ ہیں کہ ظلِّ سُبحانی ہی ادا کر سکتے ہیں۔ ہم نے اپنا کھانا کھایا اور پھر چائے پینے کے لئے ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ اتنی خوبصورت جگہ پر اتنا ہی خوبصورت ہوٹل ہونا چاہیئے۔ لاؤنج میں دُکانیں ہی دُکانیں تھیں مگر قیمتیں اتنی زیادہ تھیں کہ دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ واپس آنے کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو تھک کر چُور ہو گئے تھے۔ گاڑی چلی تو ارد گرد کے نظاروں نے جیسے تھکاوٹ کو نچوڑ کر بدن سے جُدا کر دیا۔ رات کو اپنے گھر میں سوئے تھے مگر دماغ گھر میں نہیں تھا۔ صبح اُٹھے تو ہم نے کہا رات ہم خواب میں کاشکوجیما میں تھے۔ بیگم نے کہا مَیں بھی اور بچّوں نے کہا ہم بھی! چھوٹی بیٹی سعدیہ ابھی بول نہیں سکتی ورنہ ضرور کہتی مَیں بھی!

## ۵

ایک صاحبزادہ کلاس میں دیر سے آئے تو ہم نے پوچھا "بیٹے! آپ دیر سے کیوں تشریف لائے ہیں؟"

صاحبزادہ نے بلا جھجک تُرت جواب دیا۔ "جی! مَیں رات کو بہت دیر تک شراب پیتا رہا اس لیئے صبح وقت پر آنکھ نہیں کھُلی۔"

ہم نے حیرت سے اُس کے مُنہ کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی ایسا تاثّر نہیں تھا جس کی ہمیں توقع تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحبزادی تشریف لائیں۔ ہم نے پوچھا "بیٹی! آپ دیر سے کیوں آئی ہیں؟"

جواب ملا۔ "مَیں عام طور سے زیادہ شراب نہیں پیتی مگر رات ایک دوست کے ساتھ معمول سے زیادہ شراب پی لی اس لیئے ابھی تک خمار کی کیفیّت ہے مَیں دیر سے آنے کی معذرت چاہتی ہوں۔"



اس کے بعد کئی اَور بچے۔ بچّیاں دیر سے آئے ہم نے اُن سے کچھ نہیں کہا۔ معلوم نہیں کیوں؟ حالانکہ ہمیں علم ہے کہ اِس مُلک میں "ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ سب اِسی زلف کے اسیر ہوئے" کا مضمون ہے۔ مگر یونیورسٹی میں شاید ہمیں اِس بات کی توقّع نہیں تھی اور یہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ طلبا اور طالبات یوں بیہوش ہونے والے اُستاد کے مُنہ پر اپنی شراب کا چھینٹا دے دیں گے۔ بعد کو معلوم ہُوا کہ یونیورسٹی میں ایسے غیر اسلامی سوال نہیں پُوچھے جاتے۔ صرف یہ کہا جاتا ہے کہ میاں کتنے پیگ زیادہ پیئے تھے جو وقت پر نہیں آ رہے ہو؟ پہلے روز دوستوں نے پوچھا "حضرت! آپ کچھ پیتے پلاتے بھی ہیں یا نِرے خشک مُلّا ہیں؟" ہم نے کہا "کیوں نہیں؟ کافی کے ہم عاشق ہیں اور چائے تو ہماری گھُٹّی میں پڑی ہے۔" اِس پر پینے والے دوستوں کے چہرے یوں لٹک گئے جیسے درخت سے پپیتا لٹک رہا ہو۔ معلوم ہُوا ہم سے پہلے جو دوست (ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی۔ کراچی یونیورسٹی) یہاں تشریف لائے تھے وہ خشکی میں ہم سے بھی چار ہاتھ آگے تھے یعنی جاپانی چائے تک نہ پیتے تھے۔ اس لیئے دوستوں کو ہمارا وجود بسا غنیمت معلوم ہُوا کہ چلو پینے کے نام پر کچھ تو پلیتا ہے۔ گندم اگر بہم نہ رسد بھُس غنیمت است۔

جس محفل میں جاتے بیئر پیش کی جاتی۔ ہم نہایت ادب سے عرض کرتے کہ ہم بفضلہٖ تعالیٰ مسلمان ہیں اور اسلام میں شراب پینا حرام ہے لہٰذا معافی چاہتے

ہیں مگر یہ عذر کچھ دن بعد ایسا اُلٹا پڑا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ ایک اسلامی ملک کے نہایت جگادھری قسم کے مسلمان ایک مجلس میں مدعو تھے۔ شراب کا دَور چلا تو ہم نے اسی عذر کے ساتھ معذرت کی مگر میزبان نے کہا "مسلمان شراب نہیں پیتے؟ وہ دیکھو!" دیکھا تو وہ حضرت خُم پہ خُم لنڈھا رہے تھے۔ ہم نے خفیف ہو کر میزبان سے کہا "وہ اَور قسم کے مسلمان ہیں اور ہم ذرا اَور قسم کے مسلمان ہیں۔" اس کے بعد ہم نے یہ عذرِ لنگ ترک کر دیا اور اب صرف یہ کہہ کر معذرت کر لیتے ہیں کہ افسوس ہم اس سے محروم ہیں۔ اس پہ ہمیں ایک اَور فلپائنی بزرگ یاد آئے جن سے جاپان آتے ہوئے طیارہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ منیلا سے طیارہ میں سوار ہوئے اور بآوازِ بلند "السلام علیکم" فرمایا۔ ہم نے وعلیکم السلام کہا تو کھچے چلے آئے اور ہمارے ساتھ کی سیٹ پر تشریف فرما ہو گئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ خاصے نیک اور بزرگ مسلمان لگتے تھے مگر کھانے سے پہلے ہوسٹس نے مشروبات کے بارہ میں پوچھا تو بیئر سے شروع کر کے شمپین تک پیتے چلے گئے اور اُس وقت تک تمت بالخیر نہیں کہا جب تک خود ہوسٹس نے دُکان نہیں بڑھائی! مگر کھانے کے معاملہ میں سختی سے تاکید فرماتے رہے کہ سُور کے گوشت کی ملونی نہ ہو کہ اسلام میں جائز نہیں ؎

منم کہ طوفِ حرم کردہ ام بُتے بکنار
منم کہ پیشِ بُتاں نعرہ ہائے ہُو زدہ ایم



اِسی قبیل کی ایک اَور محفل میں بہت دیر تک لوگ دخترِ رز سے کھیلتے رہے۔ ہم بھی کچھ دوستوں کے ساتھ حاضر تھے۔ ایک ثقافتی تقریب تھی۔ جب محفل کا اختتام ہُوا اور اُٹھنے کا وقت آیا تو صرف ہم ہی ہوش و حواس میں تھے باقی لوگ سب کے سب سرنگوں تھے ؏

یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

ایک صاحب دُور سے ہمیں دیکھ کر لپکتے ہوئے آئے اور حقارت سے ان مسجودِ ملائک کی طرف دیکھ کر فرمایا "یہ لوگ بڑے کم ظرف ہیں۔ آئیے ایک دَور اَور ہو جائے۔"

اِس قسم کے ایمان افروز نظارے روز دیکھنے میں آتے ہیں مگر یہ لوگ پی پلا کر سرِعام وہ حرکات نہیں کرتے جو ہمارے ہاں ایک چُلّو میں بہک اُٹھنے والے کرتے ہیں۔ شریف لوگ ہیں محفل سے نکلتے ہیں تو تین تین کی ٹولیوں میں بٹ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا بازو پکڑ لیتے ہیں تاکہ کوئی گرنے نہ پائے۔ گاڑی میں ایسے لوگوں کے لیئے جگہ خالی کر دی جاتی ہے۔ پیتے تو سب ہیں مگر گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر۔ میخانوں میں جانا شرافت کے علاوہ جیب پر بھی بھاری ہوتا ہے۔ شرفاء اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتے اِس لیئے کبھی کوئی شریف آدمی سرِعام نشے میں دکھائی نہیں دیا۔ ہاں کچھ ٹُٹ پونجیے لڑکھڑاتے اور دامن گیر ہوتے نظر آتے ہیں اُن سے اپنا دامن آپ خود بچائیے، آپ نہیں

بچائیں گے تو کوئی نہیں بچائے گا۔

وہ نشے میں ہیں آپ تو نشے میں نہیں ہیں۔

یہاں قانون کے مطابق بیس سال سے کم عمر کے "بچوں" کے لئے شراب پینا ممنوع ہے مگر جب بچے بیس سال کے ہو جاتے ہیں تو پچھلی کسر پوری کر لیتے ہیں۔ سال میں ایک دن تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ سارے ملک میں چھٹی ہوتی ہے۔ لڑکیاں کیمونو پہنتی ہیں اور لڑکے بن سنور کے چہل قدمی کرتے ہیں۔ اِس تہوار کو "جوانی کا تہوار" کہتے ہیں۔ گویا اب ان لوگوں کو آزادی ہے۔ یہ لوگ قانونِ ممانعت سے آگے نکل آئے ہیں۔ شادی کے لئے بھی کم سے کم عمر بیس سال ہے۔ زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ اگر ہوتی بھی تو یار لوگ "ابھی تو مَیں جوان ہوں" کا نعرہ لگانے والے موجود ہیں۔ ایک پاکستانی تاجر ہیں کوئی اسّی کے پیٹے میں ہوں گے۔ مدّت العمر سے یہاں مقیم ہیں۔ ماشاء اللہ پوتوں، نواسوں والے ہیں مگر کچھ برس ہوئے آپ نے ایک خوبرو الٹرا ماڈرن بیس سالہ لڑکی سے بیاہ رچالیا۔ خوب خوش ہیں۔ اُن سے کسی نے کہا "کہیئے اب تو کوئی ارمان باقی نہیں؟" حسرت سے فرمانے لگے "اپنے پاکستان میں ہوتے تو "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن" والی بیوی ملتی یہاں چار سال بڑی لینی پڑی مگر غنیمت ہے۔" جاپان میں ہمیں ابھی تک کوئی اِس قسم کا بے جوڑ جاپانی جوڑا نظر نہیں آیا۔ بڈھا بڈھی چلے آرہے ہیں۔ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت مگر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا



ہے، مست ہیں۔ جوانوں میں لڑکا اور لڑکی چلے آرہے ہیں۔ بازو ایک دوسرے کی کمر میں حمائل ہیں اِرد گرد سے بے نیاز، کھٹ کھٹ یہ جا وہ جا۔ میاں بیوی میں بڑی رسانیت ہوتی ہے اور یہ بات ہمیں بہت پسند ہے۔ اِس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ شادی سے پہلے دونوں کُھل کھیل چکے ہوتے ہیں لہذا شادی کے بعد کھل کھیلنے کی نہیں سوچتے اور دوسری وجہ —— دوسری وجہ بھی غالباً یہی ہے!

ایک نئی اصطلاح یہاں آکے سُنی۔ ایک ہوٹل کے بارہ میں پُوچھا کہ یہ کیسا ہوٹل ہے؟ معلوم ہوا یہ LOVE HOTEL ہے۔ یا اللہ یہ LOVE ہوٹل کیا بَلا ہے۔ اِس کا نام ہوگا؟ —— بعد میں معلوم ہوا نام نہیں کام ہے یعنی جوان لوگ شریکِ حیات بننے کا فیصلہ اِنہی ہوٹلوں میں بیٹھ کر یا رہ کر کرتے ہیں۔ اے آزمانے والے یہ نسخہ بھی آزما ——!

قصہ مختصر یہ کہ یہاں ماحول ایسا ہے کہ قدم قدم پر اسلام خطرہ میں ہے کی گھنٹی بجتی ہے۔ ع

حیراں ہوں دِل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں

---

قبلہ سیّد ضمیر جعفری صاحب مدّظلہٗ نے کوہاٹ کی تعریف میں ارشاد فرمایا تھا کہ —— ریشم و کمخواب سب اندر ہے باہر ٹاٹ

جاپان میں ریشم و کمخواب سب باہر ہے اندر ٹاٹ ہے یعنی "سب کچھ" باہر ہے۔
اندر صرف ایک تتامی ہے (جاپانیوں کی فرشی کھاٹ) اور اس پر بچھا ہوا
بوریا۔ بلکہ اکثر تو آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا' کا مضمون ہے۔ یہاں قدم قدم
پر ہوٹل اور ریستوران ہیں اس قدر خوبصورت، چمکیلے اور سجے سجائے کہ ایک
بار دیکھ کر دوسری بار دیکھنے کی ہوس پیدا ہوتی ہے۔ ہمہ وقت بھرے ہوئے۔
آنے والے بھی خوش ذوق اور خدمت کرنے والے بلکہ والیاں، ان سے بھی
زیادہ مہذّب نفیس اور سجی سجائی۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی ——
ریستورانوں کی بھیڑ بھاڑ اور کثرت پر بہت عرصہ تک غور کرتے رہے آخر اس
نکتہ کو پالیا کہ ہر شخص کو اپنے گھر میں یہ آرائش اور زیبائش میسّر ہے نہ ہی دبیز قالین،
قیمتی فانوس، اعلیٰ صوفے، نفیس برتن گھروں میں مل سکتے ہیں لہذا لوگ دن میں
ایک بار یا حسبِ توفیق دو بار ضرور اپنے ذوقِ نظر کی تسکین کے لئے ریستورانوں
میں جا بیٹھتے ہیں اور قدرت کی کرشمہ سازیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دوپہر
کا کھانا تو اکثر لوگ ہوٹلوں میں کھاتے ہیں کیونکہ اپنے اپنے کام کاج پر ہوتے ہیں۔ یا
بہت کفایت شعار ہوئے تو گھروں سے ٹفن لے آئے۔ مگر شام کے وقت دفتروں
یا کارخانوں سے چھٹی ہوئی تو دوستوں کے ساتھ کسی ریستوران میں جا براجے۔ دو گھڑی
پینا پلانا ہوا اور پھر شریف لوگوں کی طرح واپس۔ گھر جہاں —— تتامی ان کا
انتظار کر رہی ہے "تدائی ما" (گھر میں داخل ہوتے وقت آنے والا یہ فقرہ کہتا



ہے)۔ آئیے آئیے خوش تو ہیں آپ کے مزاج شریف؟

کھانے پینے میں یہ لوگ بہت باقاعدہ ہیں۔ دوپہر کو ادھر گھڑی نے
بارہ بجائے اُدھر ہاتھ سے قلم یا ہتھوڑا رکھا، چاپ سٹک اُٹھالی۔ شام
ڈھلے پھر کچھ نہ کچھ ع مال باہر سے جو آیا ہے وہ اندر بھیجوں، کا وظیفہ۔ رات
کو بھی یہی کچھ ہوتا ہے مگر ہر لقمہ کو لقمۂ تر ہونا چاہیئے اور تر کرنے کے لئے
ہماری طرح گھی کا بے محابا استعمال نہیں کرتے۔ بیئر کا گھونٹ بھر لیتے ہیں۔

غریب اور امیر میں یہاں بھی بہت تفاوت ہے۔ غریب یہاں بھی بہت
غریب ہیں، امیر یہاں بھی بہت امیر ہیں۔ اسی لئے یہاں کی سوشلسٹ اور کمیونسٹ
پارٹیاں کافی مضبوط ہو رہی ہیں۔ ٹریڈ یونین ازم یہاں بھی ہے بلکہ اپنے ہاں
سے کہیں زیادہ ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ ہم صرف یونین بناتے ہیں کام نہیں
کرتے۔ یہ لوگ کام کا ہرج نہیں ہونے دیتے۔ ہڑتالیں بھی ہوتی ہیں مگر سبحان اللہ
کیا ہڑتال ہوتی ہے۔ ایسے رکھ رکھاؤ اور سلیقہ سے تو ہمارے ہاں لوگ شاید نماز
بھی نہیں پڑھتے جس خوش اسلوبی، وقار اور تنظیم کے ساتھ یہ لوگ ہڑتال کرتے ہیں۔
ہر سال بجٹ آنے سے پہلے مزدور تنظیمیں اپنے مطالبات پر زور دینے کے لیے ہڑتال کرتی
ہیں مگر اس ہڑتال کا باقاعدہ اخباروں میں اعلان ہوتا ہے، پروگرام چھاپ دیئے
جاتے ہیں کہ حضرات! فلاں تاریخ سے گاڑیوں میں ہڑتال ہے اس لیے اپنا بندوبست
کر لیجیے۔ اب کے بھی ہڑتال ہوئی۔ تمام قومی اور غیر قومی، مقامی اور غیر مقامی گاڑیاں،

بند ہوگئیں۔ مطالبہ تھا تنخواہ میں دس فیصدی اضافہ کیا جائے۔ حکومت نے کہا ۹ فیصدی سے زیادہ نہیں کریں گے —— لہذا یہ ہڑتال تاریخ کی سب سے طویل ہڑتال بن گئی۔ آخر ہڑتالی ہار مان گئے حکومت جیت گئی —— اب ہڑتالیوں کے لیڈر دھڑا دھڑ مستعفی ہو رہے ہیں کہ ہم اپنا مطالبہ نہیں منوا سکے لہذا استعفیٰ مرا باحسرت و یاس۔ نئے لوگ، نیا خون آگے آ رہا ہے مگر صاحب کیا مجال جو ایک بھی پٹڑی اُکھاڑی گئی ہو یا گاڑیوں کو نقصان پہنچایا گیا ہو۔ توڑ پھوڑ ہر شخص کے نزدیک گناہ ہے —— مگر ہمارے ہاں۔ استغفر اللہ! ہم بھی کس چیز کا موازنہ کرنے بیٹھ گئے ہیں۔ یہ قوم آزاد ہے، مادر پدر آزاد نہیں ہے۔

ہم نے ہڑتالوں کے بارہ میں بہت کچھ تحقیق کی مگر اس مُلک میں ڈاکٹروں کی ہڑتال کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔ اِس معاملہ میں صرف ہمیں ہی اوّلیت حاصل ہے۔ این سعادت بزورِ بازو نیست۔ اِس قوم کا تو یہ حال ہے کہ اگر سڑک پر چلنے والے گاڑیوں کی ہڑتال ہو تو بھی ایمبولینس گاڑیاں چلتی رہتی ہیں اور کوئی اُن پر پتھر نہیں برساتا۔ اِس معاملہ میں یہ لوگ بہت "بے حس" ہیں۔ گاڑیوں کے شیشے تک نہیں توڑتے!

اُستادوں کے بارہ میں بھی دریافت کیا۔ کیا اُستاد ہڑتال نہیں کرتے؟ مخاطب نے ہمیں سر سے پاؤں تک گھور کے دیکھا گویا ہم گھاس چر گئے ہیں اور خاموش ہو گئے۔ ہم نے دوبارہ سوال کیا تو وہ سراپا سوال بن گئے کہ "حضرت! آپ تو پیتے پلاتے نہیں یہ آج کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہیں؟" ہم نے پھر جرأت کر کے سوال دُہرایا۔



واں ایک خاموشی مری سب کے جواب میں۔ تنگ آ کر ہم بھی چُپ ہو گئے کہ یہ لوگ اُستادوں کے بارہ میں زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہیں —— ابھی سوال و جواب کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ہمارے ایک جاپانی رفیقِ کار کا (جو آجکل پاکستان گئے ہوئے ہیں) خط آیا کہ "آجکل پنجاب یونیورسٹی بند ہے کیونکہ اساتذہ نے ہڑتال کر رکھی ہے لہذا میں مری جا رہا ہوں۔" دوستوں نے حیرت و استعجاب کے ساتھ وہ خط دوبارہ پڑھا، سہ بارہ پڑھا اور پھر ہم سے کچھ پوچھنے کو ہی تھے کہ ہم نے مری کا سہارا لے کر بات ٹال دی۔ سُنو یار کتنا خوبصورت شعر کسی نے کہا ہے —— جب سے سُنا ہے یہ کہ مری جا رہی ہیں آپ۔

میرا یہ حال ہے کہ مرا جا رہا ہوں میں!

بات قہقہوں میں اُڑ گئی —— ہم بھی کیسے اُستاد نکلے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ چشمِ تصوّر نے کیا کیا نظارے دیکھے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کا جلوس نکلا ہوگا۔ اُستاذی ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی بھاری بھرکم کتابوں کا بوجھ اُٹھائے آگے آگے ہوں گے، اُن کے ساتھ اُستاذی ڈاکٹر وحید قریشی ہوں گے کہ پولیس کو گھیرا تنگ کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ دو گز کے فاصلہ پر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی ذوالفقار کو میان میں رکھے خراماں خراماں چل رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا سے اپنی خواجگی کا بوجھ اُٹھائے نہ اُٹھتا ہوگا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اِس جلوس کی بحرِ طویل میں آزاد نظم کہہ رہے ہوں گے اور سب سے نمایاں، برادرم مکرم سجّاد باقر رضوی ہونگے

جو اپنے ناتواں پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کر پولیس کو مخاطب کر رہے ہونگے ؎

اے خردمند سُن! ہم بھی دو بھائی تھے
وہ جو حاکم بنے، ہم جو رُسوا ہوئے

اس سے آگے جو کچھ سوچا وہ ہم بیان نہیں کرنا چاہتے کہ پولیس نے ان اہلِ قلم کے ساتھ جو علمی سلوک کیا ہوگا وہ کیا ہوگا؟

ہم بھی عجیب آدمی ہیں ریشم و کمخواب کا ذکر گول کر کے ہڑتال کی پڑتال میں مصروف ہو گئے مگر اصل بات یہ ہے کہ اس ذکر سے ہم دانستہ گریز کر رہے ہیں۔ ہماری بیگم نے کرنل محمد خان کا ولایت کا سفرنامہ "بسلامت روی" پڑھا تو بہت جزبز ہوئیں۔ فرمانے لگیں بجنگ آمد پڑھنے کے بعد مصنّف کا ایک گرینڈ سا تصوّر بنتا ہے مگر بسلامت روی نے اس تصوّر کو چکنا چُور کر دیا ہے لہٰذا ہم بھی اپنی بیگم کی نگاہوں سے گرنے سے بچنے کے لئے خود حفاظتی کے طور پر کرنل محمد خان سے ایک قدم آگے بڑھ رہے ہیں یعنی اس حرکت سے باز آ رہے ہیں۔

بسلامت روی و — باز آئی —

---

نہانے کے بارہ میں ہمارا بھی وہی عقیدہ ہے جو ہمارے اکثر پاکستانیوں کا ہے کہ چار دن کی زندگی کو نہانے جیسے بیکار کے شغل میں ضائع کرنا کتنی غیر شریفانہ حرکت ہے، پیدا ہوئے تھے تو دایا نے نہلا دیا، مر گئے تو غسّال نہلا دیں گے۔



اللہ اللہ خیر سلاّ۔ مگر یہ جاپانی خدا معلوم کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں روز نہاتے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ صبح کو نہیں نہاتے شام کو نہاتے ہیں۔

صبح کے نہانے کو بدشگونی سمجھتے ہیں۔ جاپانی زبان کی یہ ایک ضرب المثل ہے کہ صبح کو نہانے والا کنگال ہو جاتا ہے اور اس کنگالی سے بچنے کے لئے یہ قوم شام کو نہاتی ہے۔ حد ہو گئی مادہ پرستی کی۔ امّید ہے پاکستان کے اربابِ حلّ و عقد قوم کو صبح صبح نہانے سے روکنے کے لیے کوئی مؤثر سا قانون نافذ کریں گے۔ ہمیں تو یہاں آکر معلوم ہُوا کہ پاکستان اتنا غریب ملک کیوں ہے؟ یہ سب صبح کے نہانے کا کیا دھرا ہے — میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔

ہم جاپان میں وارد ہوئے تو ہمارے میزبان نے ہمیں سب سے پہلے وہ حوض دکھایا جو نہانے کے لئے ہمارے غسل خانے میں بنا ہُوا تھا۔ ہم نے کہا حوض کی کیا ضرورت بھی ہمارے لئے تو ایک چُلّو ہی کافی ہے شُکر ہے ہمارے میزبان اُردو کے محاوروں کا اتنا گہرا علم نہیں رکھتے تھے بات آئی گئی ہو گئی — بعد کو معلوم ہُوا کہ جاپانی حضرات شام کے وقت حوض کو گرم پانی سے لبالب بھر لیتے ہیں اور پھر اس میں تشریف فرما ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک مچھلی بنے رہتے ہیں جب تک دن بھر کی ساری تکان دُور نہیں ہو جاتی۔ بچّے بالے، چھوٹے بڑے، مرد عورت سب ہی اس آب پرستی کا شکار ہیں۔

یہیں پر بس نہیں جن حضرات کو اپنے گھر میں حوض میسّر نہیں وہ عوامی غسلخانوں

میں جا پہنچتے ہیں۔ یعنی نہانے سے نہیں رہ سکتے۔ توبہ! خدا کسی کو اتنا بھی عادت کا غلام نہ بنائے۔

ہمارے دوست مسٹر تانگے کو ایک دن کیا سُوجھی ہمیں گھر سے بُلایا اور فرمانے لگے آج آپ کو ایسی جگہ کی زیارت کروانا چاہتا ہوں جو پاکستان میں نہیں ہے۔ ہم نے کہا ایسی کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ ہم ترقی پذیر مُلک ہی سہی مگر ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ جو کچھ آپ لوگوں نے امریکہ سے سیکھا ہے وہ ہم نے نہ سیکھا ہو؟" —— تانگے صاحب مسکرا کے چُپ ہو رہے اور ہمیں نیو جاپان کلب میں لے گئے —— نیو جاپان کلب میں اہلِ ذوق کے لیے رقص اور موسیقی اور شراب کا وافر انتظام ہے —— ہم نے کہا "میاں غلط جگہ پر آگئے ہو ہم اِن تینوں کی نوازشات سے محروم ہیں"—— فرمانے لگے "ایک چوتھی آسائش بھی ہے جس کے لئے آپ کو زحمت دی ہے"۔ ہم چوتھی آسائش کے لفظ پر چونکے اور تانگے صاحب کو منجملہ دیگر اخلاقی ضوابط کے اپنے انتظام کا حوالہ بھی دیا مگر وہ سُنی اَن سُنی کر کے ہمارا بازو پکڑ کر ہمیں لے چلے۔ مرتا کیا نہ کرتا —— ایمان کی سلامتی کی دُعائیں مانگتے ہوئے اُن کے ساتھ ساتھ چلنے لگے —— ایک مقام پر فرمانے لگے کپڑے اُتار دیجئے اور یہ کہہ کر خود کپڑے اُتارنے پر آئے تو زیر جامہ تک اُتار کر رکھ دیا —— ہم کچھ دیر تذبذب میں رہے اور پھر یہ سوچ کر کہ میاں یہاں تک آگئے ہو تو بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖیھَا وَمُرْسٰھَا



—— ہم نے بھی جامۂ عُریانی زیب تن کیا —— دروازہ کھولا تو ایک جمّ غفیر ایک عظیم الشان حوض میں نہا رہا تھا —— ہم بھی نہانے لگے —— 'ایک حمام میں سب ننگے' کا محاورہ سُن رکھا تھا۔ اُس دن دیکھ لیا۔ اچھا تو یہ ہوتا ہے جاپانی پبلک باتھ یعنی عوامی غسل خانہ —— تانگے صاحب فرمانے لگے "آپ اتنے سراسیمہ کیوں ہیں؟ آخر سب انسان ایک جیسے ہی ہوتے ہیں" —— ہم نے کہا انسانوں کے ایک جیسا ہونے میں تو کچھ کلام نہیں۔ حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے —— سو ہم نے اس روز اپنی حیا کو جاپان کے عوامی باتھ میں ڈبو کر علاّمہ لطیف انور مرحوم کا ہاتھ پکڑ لیا ؎

مجھ کو ہے اپنے گنہ کا اعتراف
پہلا پتھر کون مارے گا مجھے!

مگر —— حیا کا تصوّر بھی تو ایک اضافی چیز ہے۔ جسے ہم حیا سمجھتے ہیں اس کو یہ لوگ خدا معلوم کیا سمجھتے ہوں گے؟

عوامی باتھ، یہاں کی ایک ضرورت ہے۔ اگر یہ لوگ ہر روز نہ نہائیں تو جئیں کیسے؟ آب و ہوا ایسی ہے کہ جسم کو آلائشوں سے پاک رکھنے کے لئے روز کا غسل ضروری ہے اور اتنی جگہ ان لوگوں کے پاس نہیں کہ ہر شخص کے لئے علیحدہ علیحدہ غسل خانے تعمیر کرتے پھریں۔ سر چھپانے کو جگہ مل جائے وہی غنیمت ہے۔

پُرانے زمانے میں یہ لوگ نہانے کے لئے گرم چشموں پر جاتے تھے۔ گرم چشمے،

قدرت نے اُنہیں عطا کئے تھے۔ زمین کے اندر خدا جانے کتنی گرمی تھی۔ جگہ جگہ گرم پانی کے چشمے اُبل آتے تھے اور لوگ جوق در جوق وہاں پہنچتے اور نہاتے تھے (اور اب بھی نہاتے ہیں) اور اسی لباس میں نہاتے تھے اور نہاتے ہیں جس لباس میں پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ جاپان کا فیشن نہیں ہے جاپان کی تہذیب ہے۔

ایک جگہ اب بھی جاپان میں ایسی ہے جہاں خواتین و حضرات اکٹھے نہاتے ہیں۔ وہ جگہ SAPPARO کے علاقہ میں ہے۔ ہمارے ایک ہندوستانی دوست وہاں گئے۔ واپس آئے تو مُنہ لٹکا ہُوا تھا۔ پُوچھا "میاں خیر باشد — سپّرو کے عوامی ہاتھ سے یہ خوفناک چہرہ لئے لَوٹے ہو؟" — فرمانے لگے — "ساڑھے تین لاکھ ین (تقریباً بارہ ہزار روپیہ) ضائع کر آیا ہوں یہ دیکھنے کے لئے کہ عورتیں اور مرد اکٹھے نہاتے ہیں کہ نہیں — سو دیکھا کہ خواتین مَردوں کے ساتھ ہی نہاتی ہیں مگر انہیں اپنے وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے!" — "کس وقت کا؟" ہم نے تجسّس سے پُوچھا — سادگی سے فرمانے لگے "یہی پنشن کے وقت کا اور کس کا!" — گویا پُرانے فیشن کے لوگ اب بھی اپنی تہذیب سے چمٹے ہوئے ہیں۔

ہم نے عرض کیا نا — حیا کا جو برانڈ ہمارے ہاں پایا جاتا ہے وہ یہاں کام نہیں آتا (شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے ہاں بجلی ۲۲۰ وولٹ کی ہوتی ہے اُن کے ہاں ۱۱۰ وولٹ کی۔) یہاں عُریانی کا تصوّر بھی ہمارے ہاں کی عُریانی



سے بالکل مختلف ہے۔ شروع شروع میں دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹر دیکھے یا ٹی وی میں اشتہار دیکھے تو اپنی مسلمانی کو سنبھالتے پھرے کہ خواتین ننگی چھاتیاں لئے پڑی پھرتی ہیں۔ رسائل میں دھڑا دھڑ ننگے دھڑ کی تصویریں چھپتی ہیں — دیواروں پر پوسٹر لگائے جاتے ہیں مگر کسی کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ ابتداء میں ہمارے کانوں پر تو رینگتی تھی اب جُوئیں ختم ہو گئی ہیں یا کان بے حس ہو گئے ہیں ؎

طبیعت کو ہو گا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

سو اب طبیعت ٹھہر گئی ہے۔ بچّوں کی طرف سے کچھ کچھ تردّد تھا مگر ان کی سیر چشمی دیکھ کر وہ تردّد بھی جاتا رہا۔ ؏

کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

○

## ۶

ہم نے پہلے پہل اسے ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور کے کاؤنٹر پر دیکھا تو پروفیسر غلام جیلانی اصغر بہت یاد آئے ؎

"نیلی نیلی آنکھیں اُس کی
گہری ۔ گہری ۔
ٹھہری ۔ ٹھہری
پتلے پتلے ہونٹ تھے اُس کے،
جیسے اِک باریک قلم سے غالب کا دیوان لکھا ہو۔"

دوسری بار ایک سُپر مارکیٹ میں سامنا ہُوا تو اپنے شاگرد عزیزی نعیم قدسی یاد آئے ؎

"حُسن کی سیتا، عشق کی آذر، مدھ ماتی، متوالی،



دھیرے دھیرے تکنے والی،
خاموش اور انجان،
لیکن پتھر ہونٹوں والی،
بے حس اور بے جان"

ہم نے بیگم سے اُس کے حُسنِ جہاں سوز کا ذکر کیا تو بھڑک گئیں۔ آخر ہم ایک روز اسے اپنے گھر لے ہی آئے۔ بیگم نے قریب سے دیکھا تو بھڑک گئیں اور اُس کے حُسن کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اب وہ ہمارے گھر میں ہے ——— اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جاپان والوں کو گُڑیاں بنانے میں کتنا کمال حاصل ہے !!

اِس قوم کو حُسن سے عشق ہے۔ پھُولوں، پتّوں، جانوروں، پہاڑوں، دریاؤں، ندی نالوں اور انسانوں کے حُسن سے ——— بچّوں کے تو یہ لوگ غلام ہیں کیونکہ بچّہ قدرت کا سب سے حسین شاہکار ہوتا ہے۔ ہمارے ایک کرم فرما، مولٰینا الف م ن ہیں ہمیں ان کی یہ بات بہت یاد آتی ہے کہ ایک بار گدھے کے بچّے کو دیکھ کر اُن پر وارفتگی طاری ہو گئی۔ فرمانے لگے "سُبحان اللہ! کتنا خوبصورت بچّہ ہے ہم بھی بچپن میں ایسے ہی ہوں گے۔" ہم نے بصد ادب عرض کی "مولٰینا! بچپن کو چھوڑیئے آپ تو اب بھی ماشاءاللہ ....." اِس پر وہ لٹھ لے کر ہمارے پیچھے دَوڑے ——— مگر ——— اگر مولٰینا یہاں جاپان میں ہوتے تو

یہ لوگ اُن کے ارشادات کو سنہری حروف میں لکھ کر نیون سائن بنا لیتے (اس
فقرہ میں جو اگر مگر ہم نے کی ہے وہ مولینا کے لٹھ کا کرشمہ ہے "ع کرشمۂ دامن دل می کشد")

یہ لوگ حُسن کی تعریف کے لئے استعاروں کا سہارا نہیں لیتے، برادرم سیّد
سجّاد باقر رضوی کی مخصوص اصطلاح میں 'استعارہ کے خوف' میں مبتلا ہیں، سیدھے
سادے لفظوں میں حُسن کی تعریف کرتے اور سر دُھنتے ہیں۔

'بانسوں کے جُھنڈ پر جہاں چڑیاں چہچہا رہی ہیں
سورج اپنا رنگ بدل رہا ہے'

یہ الگ بات ہے کہ ہم اِس میں اپنی تسلی کے لئے بہت سے استعارے تلاش
کر سکتے ہیں۔

بچّوں کو سکولوں میں چیچوں چیچوں چاچا قسم کے گانے یاد نہیں کروائے جاتے
خوبصورت خوبصورت سادہ سادہ گانے ــــ یاد کروائے جاتے ہیں ؎

"پھُول کھلے ہوئے ہیں
سفید، سُرخ اور پیلے
قطار در قطار
سب پھُول ہی خوبصورت ہیں
کِس کِس کو دیکھیں

اِسی قسم کا ایک اَور گانا ؎



"شہد کی مکّھی، گنگنا رہی ہے۔ بُن بُن بُن
پھُولوں پہ منڈلا رہی ہے۔ بُن بُن بُن
خوش قسمت مکّھی ــــ خوش قسمت!!

بچّے، اِن گانوں کو پیانو کی دُھن پر بجاتے اور گاتے ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔
چیری کا پھُول اُن کا قومی نشان ہے اسے یہ لوگ 'ساکورا' کہتے ہیں۔ ساکورا کا
نام لیتے ہوئے ہر شخص کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوجاتی ہے۔ اپریل
اور مئی میں یہ پھُول کھِلتے ہیں تو یہ قوم پاگل ہوجاتی ہے۔ مئی کا پہلا ہفتہ تقریباً سب
کا سب قومی چھُٹی کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اِس ہفتہ کو سنہرا ہفتہ یعنی GOLDEN
WEEK کہا جاتا ہے۔ اِس ہفتہ میں لوگ شہروں سے نکل کر باہر کھُلی فضاؤں میں جاتے
ہیں اور ساکُورا دیکھتے ہیں۔ چیری کا پھُول ــــ سفید سفید، نازک نازک، ملائم
اور شفاف ــــ ہلکی ہلکی مہک ــــ سارا ملک اِس عرصہ میں مہکا ہوا ہوتا
ہے۔ لوگ ان پھُولوں کو اتنے خلوص اور اتنے پیار سے دیکھتے ہیں گویا عبادت
کر رہے ہیں۔

اِس دَوران ان لوگوں نے ہم سے بارہا یہ سوال کیا کہ پاکستان کا قومی
پھُول کون سا ہے؟ ایک دو کو ہم نے گوبھی کا پھُول بتایا ــــ مگر دفعۃً خیال
آیا کہ گوبھی کا پھُول تو یہاں بھی ہوتا ہے یہ لوگ ہماری قوم کو بادی النظر میں
"بادی قوم" سمجھنے لگیں گے۔ ہم نے گلاب کے پھُول کا نام لیا۔ مگر زبان گلقند کا

ذائقہ محسوس کرنے لگی ــــ اتنی دیر میں یہ ہفتہ گزر گیا۔ درختوں سے سا گورا کے پھول جھڑ گئے۔ زمین سفید ہو گئی ــــ ع آندھی چلی تو لے گئی اُن کو اُڑا کے ساتھ!
لوگوں نے یہ سوال پوچھنا بند کر دیا۔ اگلے سال مئی تک چھٹی ہو گئی۔ اگلے سال پوچھیں گے تو دیکھا جائے گا ؎

جب حشر کا دن آئے گا

اُس وقت دیکھا جائے گا

پھولوں سے ان کے عشق کا یہ عالم ہے کہ گھروں میں اور گھروں سے باہر ہر جگہ گملوں میں پھول اُگا رکھے ہیں۔ اُن کی آبیاری بڑے خشوع و خضوع سے کرتے ہیں، پالتے ہیں پوستے ہیں، چومتے ہیں، جھومتے ہیں۔ یہاں کا ہر شخص مولوی عبدالحق کا نام دیو مالی ہے۔

کاغذ کے پھول بنانے میں یہ لوگ فرد ہیں۔ یہ فن دُنیا نے انہی لوگوں سے سیکھا ہے۔ پلاسٹک سے مجسّمے اور پھول پتّیاں بنانا ان لوگوں پر ختم ہے۔ مجسّموں کا یہ حال ہے کہ جیتے جاگتے انسانی وجود تیار کر لیتے ہیں۔ ہم ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور سے کچھ خریدنا چاہتے تھے۔ بیگم کو اس چیز کا سٹال نہیں مل رہا تھا۔ سامنے ایک خاتون کھڑی تھیں بیگم جھپاک سے ان سے پوچھنے کو لپکیں مگر وہ مجسّمہ تھا۔ ایک جگہ ایرانی قالینوں کی نمائش تھی ایک صاحب انہماک سے ایک قالین پر جھکے ہوئے محدّب شیشے سے قالین کی بُنائی دیکھ رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد دیکھا تو حضرت



اسی طرح منہمک نظر آئے۔ اگلے روز بھی وہی نقشہ، وہی جذبہ، وہی عالم دیکھا تو معلوم ہوا یہ بھی مجسّمہ ہے۔

غرض اِس مُلک میں اصلی اور نقلی حُسن کی وہ فراوانی ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور کلمۂ حق یہ ہے کہ اصلی اور نقلی میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے۔ خواتین کے چہروں پر جو تازگی اور نکھار ہے وہ بھی مصنوعی ہے اِس لئے احتیاط کی ضرورت ہے ایسا نہ ہو کہ لیلیٰ کے چہرے سے میک اَپ کا نقاب اُترے تو اندر کوئی اَور اصلی لیلیٰ بیٹھی ہوئی ہو۔

ایک دوست نے پاکستان سے استفسار کیا کہ جاپانیوں کی خوراک کے بارہ میں کچھ بتائیے سُنا ہے یہ لوگ چوہے تک کھا جاتے ہیں؟ نہ صاحب نہ! یہ لوگ چوہوں کو ہرگز نہیں کھاتے۔ صرف انہیں پالتے پوستے، پوجتے اور برکت کا موجب سمجھتے ہیں۔ البتہ سمندر کی کوئی بھی مخلوق ان کی دست برد سے محفوظ نہیں ہے۔ جھینگا، گھونگھا، مچھلی، کیکڑا، سمندری سانپ، سب کچھ بڑی صفائی سے ہضم کر جاتے ہیں۔ رہے مینڈک! تو وہ اِس ملک سے بھاگ کر تائیوان چلے گئے ہیں۔ جو بچ گئے ہیں، وہ ابھی تک سہمے ہوئے ہیں۔

ہم ایک دوست کے ہاں مدعو تھے، کھانا کیا کھایا جہاد کیا اور جہاد بھی جہادِ اکبر۔ سب سے پہلے سُوپ پیش کیا گیا۔ اس میں مُنّی مُنّی مچھلیاں تیر رہی تھیں اور کھانے والے کو "پنجابی میں باقاعدہ آنکھیں مارتی تھیں"۔ ہم نے کچھ تذبذب کا اظہار کیا



تو میزبان نے فرمایا "مچھلی کھانے کی ضرورت نہیں، صرف شوربہ پی لیجئے۔ سو ہم نے آنکھیں بند کر کے آنکھوں سمیت اُبالی ہوئی مچھلی کا شوربہ سُڑک لیا۔ اتنی دیر میں ایک ڈِش آئی۔ پُورے کا پُورا کیکڑا، تلا رکھا تھا، میزبان کی رال ٹپکنے لگی اور ہم اُدھر اُدھر جھانکنے لگے کہ اِس کمبخت کے نظارے سے بچ سکیں مگر کہاں؟ جس طرح چٹخارے لے لے کر میزبان نے اسے تناول فرمایا اور جس بے ادبی کے ساتھ ہم نے اسے ہاتھ لگایا، وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ہم لقمہ اندر بھیجتے تھے، معدہ اسے باہر بھیجتا تھا۔ ہم اِسی کھینچا تانی میں رہے اور وہ کیکڑا میزبان کے مبارک ہاتھوں تمام ہُوا تو ہماری جان میں جان آئی۔ ان کی بیگم نے کہا "شاید مہمانِ عزیز کو زیادہ پسند نہیں آیا، اچھا یہ کچّی مچھلی، بڑی لذیذ ہوتی ہے یہ چکھئے"۔ لیجئے صاحب! ابھی اِس جان ہار کیکڑے سے چھٹکارا ملا تھا، اب یہ کچّی مچھلی تیار ہے۔ مچھلی کے گوشت کے بڑے خوبصورت قتلے سامنے رکھے تھے، کہیں کہیں خونِ ناحق کی سُرخی بھی موجود تھی۔ میزبان نے کہا بسم اللہ کیجئے۔ یہ دیکھئے کتنا خوبصورت ملائم گوشت ہے۔ سو ہم نے وہ کچّا گوشت بھی کھا لیا اور میزبان کا دل رکھنے کے لئے اس کی لذّت کی تعریف بھی کی۔ اس کے بعد چاول آئے۔ سُبحان اللہ! کیا لحیم شحیم چاول تھے۔ یہ موٹے موٹے، ایک دوسرے سے گتھم گتھا، ایک طرف سمندری گھاس میں لپٹے ہوئے چاولوں کے گولے سے تھے، کسی کے اندر سبزی کا قتلہ رکھا تھا، کسی کے اندر گوشت کا ٹکڑا، ایک کے اندر سے مچھلی جھانک رہی تھی۔ فرمایا "تناول فرمائیے یہ ہمارے ہاں کا

سب سے مرغوب کھانا ہے۔ چنانچہ وہ بھی کھائے۔ اور حسبِ تہذیب "اُوِشی" یعنی
"بہت لذیذ" کا نعرہ بھی لگایا۔ اس کے بعد کچھ سخن ہائے گفتنی و ناگفتنی کا دَور
رہا اور جب معدہ کو تھوڑا سا آرام مل چکا تو کھانے کا دوسرا دَور شروع ہُوا۔
یہ دَور واقعی لذیذ دَور تھا۔ قیمے کے قتلے تھے، کچھ ہمارے ہاں کی کباب کی سی خوشبو
بھی تھی، مچھلی کا پلاؤ تھا، سویابین سے تیار کئے ہوئے نرم نرم نمکین ٹکڑے سے
تھے، گول گول تلے ہوئے پکوڑے سے تھے۔ غرض ہم نے میزبان کا دل رکھنے کے لئے
نہیں بلکہ اپنی رغبت سے وہ سارا کچھ ہڑپ کر لیا اور بدقسمتی سے کہہ بیٹھے کہ یہ قیمے کے
قتلے بڑے مزیدار تھے۔ فرمایا "ہاں! کیکڑے کا قیمہ بہت ہی مزیدار ہوتا ہے"۔ ہم
نے ایک لمبی ہُوں کی اور ابھی اِس خطا پر نادم ہو رہے تھے کہ ارشاد ہُوا "یہ جو پکوڑے
ہیں اِن کے اندر سمندری سانپ کا گوشت بھرا ہُوا تھا کیا آپ کو پسند نہیں آئے؟"

اب ع کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔

اس کے بعد کھانے کا تیسرا دَور بھی ہُوا مگر وہ مولویانہ دَور تھا یعنی سب کچھ
مرغی کے گوشت سے تیار کیا گیا تھا۔ چوتھا دَور کھانے کا نہیں پینے کا تھا اور خوب
دَور چلا۔ میزبان نے جوشؔ صاحب کی طرح گھڑی رکھنے کی بجائے مجازؔ مرحوم
کی طرح گھڑا رکھ کر پی اور ہم چائے کے فنجان میں غرق رہے۔ جب رخصت ہوئے
تو فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی جاپانی کھانے کی دعوت قبول نہیں کریں گے ــــ
مگر آپ سے جھوٹ کیوں بولیں۔ ہم بھی "ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد"



کے مصداق کیکڑے کا گوشت پسند کرنے لگے ہیں۔ اِس کمبخت کے پکوڑے تو بہت ہی
لذیذ بنتے ہیں۔ یہ دیکھئے! تَلا رکھا ہے اور کیسی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہے
تناول فرمائیے۔ آپ تو تکلّف کر رہے ہیں! ــــ یہ مچھلی بھی چکھئے! "بُو آتی ہے؟"۔
"نہیں۔ بُو تو نہیں ہے۔ سُنا ہے کبھی ہوتی تھی۔ جب سے ہم جاپان میں آئے ہیں اس
کی بُو ختم ہو گئی ہے"۔

جاپانی کھانوں میں 'تیم پورہ' اور "سُکی یاکی" بہت لذیذ اور مزیدار کھانے ہیں۔
تفصیلات پُوچھنی ہوں تو بیگم اختر ریاض الدین سے پُوچھ لیں، مگر عام لوگوں کی غذا
چاول ہے اور اس کے ساتھ گاڑھا شوربہ جسے یہ لوگ 'کلے رائس' کہتے ہیں۔ یہ 'کلے'
انگریزی CURRY کا جاپانی چربہ ہے۔ مگر مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات!
جاپانی حضرات لام کی جگہ رے اور رے کی جگہ لام کی آواز نکالتے ہیں۔ وہ حضرات
بھی جو شین قاف سے درست ہوں گے لام پر آ کر رام' اور رام پر آ کر لام ہو جائیں گے۔
جاپان میں آ کر "برٹرینڈ رسل" "بل ٹلنڈ لسّر" بن جائے گا۔ محمد علی اور انوکی کے مقابلہ
کے زمانہ میں انوکی صاحب نے جبھی تو فرمایا تھا کہ مَیں 'اری' کو مسل کر رکھ دوں گا۔
ــــ کیونکہ 'اری' جاپانی زبان میں چیونٹی کو کہتے ہیں۔
بات کھانوں سے چلی اور چرتے چرتے یعنی چلتے چلتے مُکّہ بازی تک آ گئی ــــ
اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ حضرات سُکی یاکی کو 'اوساکے' کا چھینٹا دے کر تیار کرتے
ہیں۔ اور 'اوساکے' جاپان کی مشہور شراب ہے۔ ہم تو اِس 'اوساکے' کا نام سُن کر ایسا

رہے کہ ہیں کہ 'سُکی یا کی' تک نہیں کھاتے۔ گھر میں تیار کرنے کی کوشش کی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اور یہ مولوی مدن ہمارے دوست ہاماگوچی صاحب ہیں جن کی دعوت پر ہم نے سُکی یا کی چٹخارے لے لے کر کھائی اور بعد میں اوساکے کی خبر پا کر کُلّیاں کرتے پھرے۔

'اوساکے' کا اصلی نام صرف 'ساکے' ہے مگر جاپان والے جس چیز کا نام بہت ہی احترام اور محبت اور تقدّس سے لینا چاہتے ہیں اس کے ساتھ 'او' کا لفظ زائد کر دیتے ہیں۔ سو، اوساکے کا مطلب ہے 'ساکے شریف'۔ مثلاً اگر ہم جاپانی میں گولڑہ شریف کہنا چاہیں تو 'اوگولڑہ' کہہ دینا کافی ہے اور کسی تردّد کی ضرورت نہیں۔

جاپان میں ایک اور لفظ نے ہمیں بہت پریشان کئے رکھا وہ لفظ ہے 'سان' جس کا عمومی مطلب ہے 'صاحب'۔ مثلاً زید صاحب کو زید سان اور بکر صاحب کو بکر سان کہتے ہیں مگر حد یہ ہے کہ یہ حضرات بلّی کو بھی بلّی سان اور چوہے کو چوہا سان کہتے ہیں۔ پہاڑ کو بھی پہاڑ سان۔ فیوجی یاما جو جاپان کا سب سے اونچا اور مقدّس پہاڑ ہے فیوجی سان کہلاتا ہے۔ سان کا لفظ مذکر مؤنث دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے اور جاپانی لوگ مرد اور عورت دونوں کو ایک ہی 'سان' سے ہانکتے ہیں۔ مگر اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پڑھتے تو 'سان' ہیں مگر لکھتے سان ہیں۔ مثلاً جاپان سے کسی مشاعرہ کا دعوت نامہ بھیجا جائے تو وہ اس قسم کا ہوگا کہ "اس مشاعرہ میں کشور ناہید سان اور یوسف کامران سان کے علاوہ اُستاد دامن سان بھی شرکت فرمائیں گے۔"



بات 'سان' کی چلی تو بہادر خان یاد آئے۔ پروفیسر بہادر خان بلوچستان یونیورسٹی کے اقتصادیات کے استاد ہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جاپان تشریف لائے ہوئے ہیں کبھی ہمارے ہاں بھی تشریف لاتے ہیں۔ اس رعایت سے ہم انہیں "گاہے گاہے باز خواں" کہتے ہیں ـــــ

جاپانی لوگ 'سان' تو ہر ایرے غیرے کو کہتے ہیں مگر جہاں بہت ہی ادب کا مقام ہو وہاں 'ساماں' کا لفظ استعمال کرتے ہیں مثلاً احمد ندیم قاسمی ساماں، وزیر آغا ساماں! ہم بہادر خان سے ملنے کے لئے اُن کے ہاسٹل میں گئے۔ دفتر والوں سے کہا کہ ہم پروفیسر بہادر خان صاحب سے ملنا چاہتے ہیں انہیں اطلاع کر دیجئے۔ انہوں نے اندرونی نشری نظام پر نشر کرنا شروع کیا "پاکستان کے پروفیسر خانساماں تشریف رکھتے ہوں تو اُن کے مہمان اُن کے منتظر ہیں ـــــ پاکستان کے خانساماں، پاکستان کے خانساماں" ـــــ ہمارا صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہم نے کہا "ملعونو ہم پروفیسر بہادر خان کو بُلا رہے ہیں تم نے یہ کیا خانساماں خانساماں کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بہادر خان ہنستے مسکراتے اپنے چاندی جیسے بالوں میں انگلیاں پھیرتے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں ـــــ ہم نے کہا "میاں! یہ خانساماں کب سے بن گئے ہو؟" فرمایا "جو پٹھان یار اچھوت پروفیسر یہاں آئے گا یہی کہلائے گا۔ شکر کیجئے کہ آپ کے طلبا اور طالبات آپ کو صرف پروفیسر ناصر

کہتے ہیں پروفیسر ناصر احمد خان ساماں نہیں پکارتے"! ہم نے واقعی اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں خانساماں ہونے سے محفوظ رکھا ورنہ خان کا سابقہ تو ہمارے نام کے ساتھ بھی تھا ؎

کوئی کمی نہ کی تھی دلِ نابکار نے
مجھ کو بچا لیا مرے پروردگار نے

آجکل جاپان میں گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را کے مصداق لاک ہیڈ سکینڈل کا بار بار تذکرہ ہو رہا ہے۔ یہ لاک ہیڈ سکینڈل بھی ایک عجیب بحرِ بے کراں ہے اور ع

سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بے کراں کے لئے

اور ـــ ہمارے لئے تو ذاتی طور پر بھی یہ سکینڈل بہت اہمیت رکھتا ہے کیوں؟ یہ بھی سُن لیجئے۔

ایک روز ہم یونیورسٹی سے باہر نکلے تو ایک شناسا سے مڈھ بھیڑ ہو گئی اُن کے ساتھ اُن کے کوئی شناسا تھے۔ آپنے تعارف کروایا کہ یہ پاکستانی پروفیسر ہیں تو اُن صاحب نے عجیب تحقیر آمیز طنز کے ساتھ فرمایا "پاکستانی؟ اچھا! اچھا!!"۔ ہمیں بہت تاؤ آیا مگر کیا کر سکتے تھے۔ خون کے گھونٹ پی کر چُپکے ہو رہے مگر ذہن عجیب خلجان میں گرفتار تھا کہ اس جاپانی نے ایسی بدتمیزی کیوں کی ہے؟ پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ حضرت نشے میں ہوں گے اور اِس ملک میں نشے



میں کی ہوئی ہر حرکت قابلِ عفو و درگزر ہے مگر اگلے روز صبح سویرے انگریزی اخبار ملا تو ہمیں معلوم ہُوا کہ وہ حضرت نشے میں نہیں تھے۔ یہاں انگریزی اخباروں میں عموماً باسی خبریں چھپتی ہیں اِس لئے جس خبر نے ہمیں ایک دن بعد پشیمان کیا وہ ایک دن پہلے اُن کی نگاہوں سے گزر چکی تھی! خبر یہ تھی کہ ہمارے کچھ وردی پوش حضرات ایک باوردی طیارہ میں، طیاروں کے فالتو پُرزے خریدنے کے لئے یورپ کے ایک مُلک میں گئے تو اتنے بڑے طیارہ کو خالی لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھوڑی سی چرس بھی ساتھ لیتے گئے۔ اُدھر ان لوگوں نے غیر انسانی حرکت یہ کی تھی کہ کُتّوں کو چرس سونگھنے پر مامور کر رکھا تھا، اُن کتّوں نے سونگھ کر بتا دیا کہ اس طیارہ میں چرس ہے لہذا وہ حضرات، انسانوں کے ان ازلی دشمنوں کے کہنے پر دھر لئے گئے ع پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق! تب ہمیں معلوم ہُوا کہ اس جاپانی نے یہ غیر جاپانی حرکت کیوں کی تھی! مگر قصور اپنا تھا اس لئے ہم مُنہ چھپاتے پھرے۔ اس کے کچھ روز بعد ہی اس سکینڈل کا انکشاف ہوا تو ہم بھی اِس قابل ہوئے کہ سر اُٹھا کر چل سکیں ورنہ یہ جاپانی تو ہمیں کہیں کا نہ چھوڑتے!

ع رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم!!

لاک ہیڈ کے چھینٹے بہت بہت دُور دُور تک اُڑے ہیں مگر ہم مشتے از خروارے کے طور پر تبرکاً چند چھینٹوں کا تذکرہ کریں گے۔ مگر واقعات سُننے سے پہلے اسماء الرجال یعنی شخصیّات سے تعارف حاصل کر لیجئے تو زیادہ بہتر ہے۔

کدامہ یوشیو : داہنے بازو کے سیاسی جوڑ توڑ کے ممتاز ماہر، عمر ۶۹ سال، اندازاً جائیداد تقریباً پندرہ کروڑ ڈالر، کنگ میکر کے نام سے معروف تھے۔

مسٹر اوسانو کینجی : دائیں بازو کے سیاسی چالباز، عمر ۵۹ سال۔ جاپان میں جائیداد دس کروڑ ڈالر، امریکہ اور ہوائی میں تقریباً بیس کروڑ ڈالر۔

مسٹر تناکا کاکوئے : جاپان کے سابق وزیر اعظم، دائیں بازو کی حکومتی پارٹی ایل ڈی پی کے سابق چیئرمین ۔ اندازاً جائیداد ۵ کروڑ ڈالر۔

ماروبینی کارپوریشن : جاپان کا مشہور تجارتی ادارہ۔ غیر ملکی تجارت میں سب سے اوّل۔ (اوساکا میں پاکستان کے اعزازی قونصل جنرل اسی ادارہ کے ایک بڑے افسر ہیں) لاک ہیڈ کے باقاعدہ ایجنٹ۔

اے این اے : آل نیپن ایئر ویز۔ جاپان کی اندرونی پروازوں کی اجارہ دار کمپنی۔

بات صرف اتنی ہی تھی کہ لاک ہیڈ کارپوریشن نے اپنے ٹرائی سٹار جیٹ طیارے فروخت کرنے کے لئے جاپان کے دو مشہور بل ڈوزروں کی خدمات حاصل



کیں کہ وہ ان طیاروں کی فروخت کے لئے زمین ہموار کریں۔ چنانچہ کدامہ صاحب اور اوسانو صاحب نے بڑی محنت سے زمین ہموار کی اور محنتانہ کے طور پر ستر لاکھ ڈالر وصول پائے۔ ماروبینی کارپوریشن والوں نے یہ رقم اُدھر سے وصول کی اور اِدھر ادا کر دی۔ مگر صرف ذرا سی غلطی یہ کی کہ رسید لکھتے وقت سَو ملین ین کی بجائے صرف یہ لکھا کہ "سَو مونگ پھلیاں وصول پائیں"۔ دوسری رسید پر یہ لکھ دیا کہ "یونٹ وصول پائے"۔ اب جواب دہی کرتے پھر رہے ہیں کہ مونگ پھلیاں کدھر گئی ہیں اور یونٹ کس کھاتے میں ڈالے گئے ہیں؟ ع

وہ ولولے کہاں؟ وہ جوانی کدھر گئی؟

جب مونگ پھلیوں کا لفظ معتوب ہؤا تو جاپان میں زلزلہ سا آگیا۔ کدامہ صاحب اور اوسانو صاحب اور ماروبینی والوں کے لئے باوجود فراخی کے زمین تنگ ہوگئی۔ ہاہاکار مچ گئی کہ ان لوگوں نے اتنی رقم جو زمین ہموار کرنے پر صرف کی ہے وہ کس کس کو دی ہے یعنی کس کس کی مُہر ہے سر محضر لگی ہوئی! بات نیچے سے شروع ہوئی اور تناکا صاحب تک پہنچ گئی جو اس زمانہ میں یعنی ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم تھے۔ ڈائٹ یعنی پارلیمینٹ میں جواب دہی کے لئے سب لوگ بُلائے گئے۔ اوسانو صاحب کی جواب دہی کا سارا منظر بیچ کھیت نشر ہوتا رہا۔ ہم نے بھی دیکھا اوسانو صاحب اتنے اطمینان سے جوابات دیتے رہے جیسے اُن کے لئے اس چیز کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ کدامہ صاحب البتہ، ہمارے محاورہ کے

مطابق بِرک گئے۔ پہلے شاید چھوٹ موٹ بیمار ہوگئے اور اب تک بیمار چلے آتے ہیں۔ درمیان میں ایک بار حالت بگڑ گئی۔ ایمبولنس میں ڈالے گئے، ہسپتال تک پہنچے مگر خلقِ خدا اُن کے دیدار سے فیضیاب ہونے کے لئے جمع ہوگئی، پولیس بلائی گئی مگر بے فائدہ، کدامہ صاحب ہسپتال میں داخل نہ ہوسکے۔ ڈاکٹر انہیں واپس لے آئے ع اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا۔

اِس دَوران حکومتی پارٹی کے اراکین کے درمیان ٹھن گئی۔ تناکا صاحب کے حامیوں اور میکی صاحب کے حواریوں میں جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ حکومت ڈانوا ڈول ہوگئی اور لاک ہیڈ کا چرچا شہ سرخیوں سے ہٹ کر گوشۂ گمنامی میں جانے ہی والا تھا کہ پورنو فلموں کے ایک مشہور اداکار نے اپنی جان کی قربانی دے کر اِس مسئلہ کو دوبارہ اُچھال دیا۔ اس ۲۹ سالہ نوجوان اداکار نے، فلائنگ کلب کا ایک چھوٹا طیارہ لیا، 'کامی کازے' والوں کی وردی پہنی اور دن دہاڑے، کدامہ صاحب کے دولت کدہ پر عین اُس مقام پر اپنا طیارہ دے مارا جہاں اُن کی خواب گاہ تھی۔ پیچھے جو نوٹ چھوڑا اس میں لکھا کہ "میں اپنی جان دے کر اپنے ملک کو ایسے بد دیانت لوگوں کے وجود سے پاک کرتا ہوں جو جاپان کی بدنامی کا باعث بنے ہیں"۔ کدامہ صاحب قسمت کے دھنی نکلے، وہ اس وقت اس خواب گاہ میں نہیں تھے۔ دولت کدہ کو تھوڑا بہت نقصان پہنچا مگر مجموعی طور پر سب خیریت رہی۔ لاک ہیڈ کا چرچا پھر تازہ ہوگیا۔ ضمیموں پہ ضمیمے شائع



ہوئے، کچھ واہ واہ ہوئی۔ کچھ لعنت ملامت! اور پھر ہوا کا رُخ حکومت کے اندرونی خلفشار کی طرف پھر گیا۔ تناکا صاحب گرفتار ہوئے۔ ماروبینی والے دھر لئے گئے، اے این اے کے مینجنگ ڈائرکٹر اندر ہوگئے۔ اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا ـــــ مگر کدامہ صاحب اور اوسانو صاحب بسترِ علالت پر دراز رہے پولیس کے ہسپتال میں نہیں پہنچے۔ صرف ڈاکٹر کی موجودگی میں پولیس والوں کو نبض دیکھنے کی اجازت ملی۔ کچھ پوچھتے یا چھتے رہے، اور کوئی الزام ثابت نہیں کر سکے۔ تناکا صاحب اکیس دن عام قیدیوں کے ساتھ سی کلاس میں سڑتے رہے اور یہی حال دوسروں کا ہوا۔ آخر ضمانت پر رہا ہوئے اور پھر ولولۂ تازہ لے کر میدان میں کُود پڑے۔

میکی صاحب جو ابھی کچھ دن پہلے تک وزیراعظم تھے، بڑے سخت جان نکلے۔ باوجود پارٹی کے اندرونی خلفشار کے مستعفی ہونے سے صاف انکار کر دیا اور بار بار اِس عزم کا اظہار کیا کہ لاک ہیڈ سکینڈل کے تمام کرداروں کو بے نقاب کر کے کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گا۔

ایک رات، دو بجے کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، وزیراعظم صاحب کو جگایا گیا کہ پراسیکیوٹر جنرل کسی اہم مسئلہ پر آپ کی رہنمائی چاہتے ہیں۔ چنانچہ پراسیکیوٹر جنرل صاحب نے وزیراعظم صاحب کو بتایا کہ ان کے ایک دستِ راست اِس سکینڈل میں ملوّث پائے گئے ہیں، اُن کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔

ہاں اگر آپ چاہیں تو اُن کو بچایا بھی جا سکتا ہے۔" میکی صاحب بہت پریشان
ہوئے مگر اصول کے پکے نکلے، ذاتی طور پر دخل دینے سے انکار کر دیا ــــ اگلے
روز معلوم ہوا کہ پراسیکیوٹر جنرل نے وزیر اعظم کو کوئی ٹیلیفون نہیں کیا تھا۔ یہ
سب کچھ جعلی تھا اور محض وزیر اعظم کو پھنسانے کے لئے کیا گیا تھا۔ کچھ روز بعد
کیوتو ڈسٹرکٹ کورٹ کے ایک جج، پراسیکیوٹر جنرل اور وزیر اعظم کی گفتگو کی
ٹیپ لے کر ایک اخبار کے دفتر میں تشریف لائے اور اخبار نے وہ گفتگو تمام و
کمال شائع کر دی۔ ایک بار زلزلہ سا آ گیا۔ مگر میکی صاحب نے بظاہر کوئی ایسی بات
نہیں کی تھی جس پر وہ دھرے جا سکیں۔ لہذا جج صاحب پر الزام آگیا کہ انہوں نے
پراسیکیوٹر جنرل بن کر وزیر اعظم کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ جج صاحب
صاف مُکر گئے کہ مَیں نے ایسا نہیں کیا، مجھے یہ ٹیپ ایک معتبر ذریعہ سے حاصل
ہوئی ہے۔ مگر میں اپنے ذاتی استحقاق کی بنا پر اس 'معتبر راوی' کا نام بتانے سے
انکار کرتا ہوں۔ سپریم کورٹ میں جواب دہی کے لئے بُلائے گئے، وہاں بھی
آپ نے یہی موقف اختیار کیا۔ سپریم کورٹ نے ڈائٹ کو سفارش کی ہے کہ ان
جج صاحب کو برطرف کر دیا جائے، اگرچہ ان کے خلاف قطعی ثبوت کوئی نہیں مگر
قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انہی حضرت کی حرکت ہے۔ آجکل جج صاحب کی
خبریں نمایاں طور پر چھپتی ہیں۔ بعض اخبارات نے تو موصوف کی نوجوانی کے
ایّام سے لے کر اب تک کے حالات پر باقاعدہ تحقیقاتی مقالے شائع کئے ہیں۔



مگر جج صاحب ہیں کہ ابھی تک ڈٹے بیٹھے ہیں ع جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے
میکی صاحب نے اپنے تحفّظ کے لئے آخری حربہ آزمایا یعنی پارلیمنٹ کو توڑ کر
نئے الیکشن کروائے۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ ایل ڈی پی کو کامیابی
تو حاصل ہو گئی مگر اتنی سیٹیں نہیں مل سکیں جتنی حکومت بنانے کے لئے ضروری
ہوتی ہیں۔ لہذا میکی صاحب نے شکست کی ذمّہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ
دے دیا اور نئے وزیر اعظم نے صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے نئی حکومت
بنائی۔ تناکا صاحب اور پارلیمنٹ کے وہ تمام اراکین جو لاک ہیڈ سکینڈل میں
ملوّث سمجھے جاتے تھے، آزاد امیدواروں کی حیثیت سے دوبارہ منتخب ہو کر
پارلیمنٹ میں پہنچ گئے ہیں ع کون ہوتا ہے حریفِ مرد افگنِ عشق!
اور اب نئے وزیر اعظم صاحب نے پھر اعلان کیا ہے کہ تحقیقات مکمّل ہو چکی
ہے اس لئے عنقریب رپورٹ شائع کر دی جائے گی۔ خدا معلوم یہ رپورٹ
شائع ہو گی یا ہمارے حمود الرحمٰن کمشن رپورٹ کی طرح سرد خانے میں رہے گی
مگر ایک بار پھر اس سکینڈل نے شہ سرخیوں پر قبضہ جما لیا ہے اور ٹی وی پر بار بار
اعداد و شمار نشر کئے جا رہے ہیں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلے میکی صاحب
وزیر اعظم تھے اور اب فکودا صاحب وزیر اعظم ہیں ــــ ع یہ چمن یونہی رہے گا
اور ..... الخ

جاپان آنے سے پیشتر ہم نے جاپان کے بارہ میں دو سفرنامے بڑے شوق

سے پڑھے تھے۔ ایک کیپٹن ایس ایم ادریس صاحب کا 'بسنگ آمد' اور دوسرا
بیگم اختر ریاض الدین کا 'سات سمندر پار'۔ 'بسنگ آمد' تو فاضل مصنّف نے
کرنل محمد خان کی 'بجنگ آمد' کے جواب میں لکھی ہے اور اسی خلوص اور ولولہ
سے لکھی ہے جس خلوص اور ولولہ سے استاد امام دین نے بانگِ درا کے جواب
میں 'بانگِ دہل' لکھی تھی اور فی الواقعہ بسنگ آمد اور بجنگ آمد میں وہی فرق
ہے جو بانگِ دہل اور بانگِ درا میں ہے۔ بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا
بہ کجا۔ مگر بسنگ آمد کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مصنّف لاڑکانے
کے رہنے والے ہیں اور کوئی بھی پاکستانی لاڑکانے کی اہمیت سے کیسے
انکار کی جرأت کر سکتا ہے۔ لاڑکانے چلو۔ ورنہ تھانے چلو!

دوسرا سفرنامہ بیگم اختر ریاض الدین کا تھا 'سات سمندر پار'! یہ سفرنامہ،
ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے اور ادبی چاشنی میں اپنی مثال آپ! مگر
اِس سفرنامہ نے ہمیں بہت دھوکا دیا۔ اگرچہ قصور اپنا تھا کہ یہ نہ سوچ سکے کہ یہ
سفرنامہ دس سال پہلے کا ہے اور ہم دس سال بعد اس مُلک کو جانے والے
ہیں۔ فرمایا بیگم اختر ریاض الدین نے کہ "ٹوکیو میں ٹیکسی شاید دنیا بھر سے ارزاں
ہے۔ دو پیسہ سوا روپیہ میں آپ کو ٹیکسی والا کہاں سے کہاں پہنچا دے گا" ——
مگر آجکل جاپان میں ٹیکسی کا کرایہ دو کلومیٹر کے لئے ۲۸۰ ین ہے اور ۲۸۰ ین کا مطلب
ہے تقریباً نو روپے تیس پیسے! وہ پاؤنڈ جو اس زمانہ میں ایک ہزار ین کے برابر



تھا اب صرف ۵۰۰ ین کے برابر ہے اور ڈالر بھی پچھلے چھ مہینوں سے ۲۹۰
اور ۲۹۵ ین کے درمیان لٹک رہا ہے۔ ین بہت تگڑا سکّہ ہے۔ مگر جاپان میں
رہنے والے اس کے بوجھ تلے پس رہے ہیں۔ قیمتیں دھڑا دھڑ بڑھ رہی ہیں اور
تنخواہ داروں کے لئے یہاں بھی مضمون واحد ہے۔ پھر فرمایا بیگم صاحبہ نے
کہ "میرا بٹوہ ہمیشہ پچاس ساٹھ ہزار ین سے بھرا رہتا تھا اور میں اپنے آپ کو
رئیسہ سمجھ کر سر اونچا کر کے چلتی تھی"۔ ہم نے جب جاپان والوں کی طرف سے
آئی ہوئی پیش کش دیکھی تو ہماری تنخواہ ان پچاس ساٹھ ہزار سے چار پانچ گُنا
زیادہ تھی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ قبول کر لی اور آنے سے پہلے ہی اپنے
آپ کو رئیس سمجھنے لگے۔ اور جب سے یہاں آئے ہیں مسلسل بیگم ریاض الدین کو یاد
کرتے ہیں۔ ہمارے بزرگ مولینا صلاح الدین احمد کی عزیزہ ہوتی ہیں ورنہ
ان کی شان میں گستاخی کے کلمات بھی سرزد ہو جاتے تو بعید نہ تھا! پھر ارشاد ہُوا
کہ "ایک شے باہر والے نہیں خریدتے اور وہ ہے جاپانی موٹر کار!" اِس کی
سچائی کا اندازہ تو ہمیں پاکستان میں ہی چیونٹیوں کی طرح فوج در فوج اور موج
در موج جاپانی موٹر کاریں دیکھ کر ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود ہم نے نئی گاڑی
کے خواب وہیں سے دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اب بھی دیکھتے ہیں مگر ذرا
احتیاط کے ساتھ!

بات یہ ہے کہ بیگم صاحبہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ لکھا ہے اور ہم بھی

جو کچھ لکھنے لگے ہیں وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ لکھیں گے: پچھلے دس سالوں میں جاپان میں مہنگائی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ بڑھی ہے۔ رہی سہی کسر تیل کے قضیّہ نے نکال دی۔ اب تو یہ حال ہے کہ سوائے ہَوا کے اَور کوئی چیز سستی نہیں اور وہ بھی ناصاف اور ناپاک!۔ اب کے اگر بیگم صاحبہ جاپان کا رُخ کریں تو اسی طرح سوچ سمجھ کر تشریف لائیں جس طرح ہمارے بزرگ حسن رہتاسی مرحوم نے "سوچ سمجھ کر جانے والے جائیں گوجرانوالے ہیں" کا مشورہ دیا تھا۔

جی تو چاہتا ہے کہ کچھ تفصیلات نرخنامے کے طور پر درج کر دوں کہ پاکستان والوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔ مگر فائدہ؟ یہاں آنے والے تو حالی سے شرط بد کے آتے ہیں ؎

زیاں ہے عشق میں یہ ہم بھی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کے لئے!

یہاں اب تک جتنے پاکستانی مسافروں سے ملاقات ہوئی ہے سوائے سیٹھ محبوب الٰہی کے سب کے سب سُود و زیاں سے بے نیاز نظر آئے اور سیٹھ محبوب الٰہی کو اللہ غنی! واقعی کوڑی کوڑی کی احتیاط کرتے دیکھا۔ اتفاق سے ہم اور وہ اوساکا کے ممتاز پاکستانی تاجر عدنان صاحب کے ہاں مدعو تھے۔ عدنان صاحب اپنی مروّت، سیر چشمی، ہمدردی اور خلوص کی وجہ سے مرجعِ پاکستانیاں ہیں۔ محبوب صاحب جلدی ہوٹل واپس لَوٹنا چاہتے تھے۔ ہم نے کہا بھائی ٹھہرو اتنی بھی کیا



جلدی ہے؟ فرمایا "جلدی اِس لئے ہے کہ پاکستان سے ٹیلیفون آنے والا ہے اور مَیں یہاں سے ٹیلیفون کر کے فارن ایکسچینج ضائع نہیں کرنا چاہتا۔" آفرین ہے۔ ہمیں اُن کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ اُن کے علاوہ جن پاکستانیوں سے ملاقات ہوئی اُن کی حرکات و سکنات اور پیشہ ورانہ مہارت کا عالَم ہی اَور تھا۔

اوساکا کی زمین دوز ریل کا سب سے اہم اور مرکزی اسٹیشن 'امیدا' OMEDA ہے۔ تقریباً ساری زمین دوز ریلیں یہاں سے ہو کر گزرتی ہیں اور رشید قیصرانی یاد آتا ہے جس کا شعر ہم نہایت بے محل استعمال کرنے لگے ہیں ؎

جاتی ہیں ترے گھر کو سبھی شہر کی سڑکیں
لگتا ہے کہ سب لوگ تری سمت رواں ہیں

اس زمین دوز سٹیشن کے ساتھ کوئی تین چار مربع میل میں پھیلا ہوا بہت بڑا زیرِ زمین شاپنگ سنٹر ہے جو "یادِ غزالِ چشماں ذکرِ سمن عذاراں" کی وجہ سے قابلِ دید تو ہے قابلِ خرید ہرگز نہیں ہے۔ ہم، کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر اسلم شاہ صاحب کو اِس شہرِ نگاراں کی سیر کرواتے پھر رہے تھے کہ سامنے تین پاکستانی شکلیں نظر آئیں۔ ایک صاحب کو دیکھ کر ہم چونک پڑے۔ ہمارے چیفس کالج لاہور کے زمانے کے ایک شاگرد معلوم ہوتے تھے۔ قریب آئے علیک سلیک ہوئی۔ ہمیں بہت تاؤ آیا کہ شاگرد ہو کر استاد سے ایسی رسمی اور سرسری علیک سلیک کر رہا ہے۔ ہم نے نام لے کر کہا "کیا آپ ہمیں پہچانتے ہیں؟" جواب ملا "جی مَیں نہیں پہچانتا، جن

جن صاحب کا آپ نام لے رہے ہیں وہ میرے بڑے بھائی ہیں" ـــــ ہم نے کہا چلو
خیر گزری۔ ورنہ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے وہ ہمارے استادانہ غرور
کو توڑنے کے لئے بہت کافی تھا۔ گلبرگ کی مین مارکیٹ میں ایک کیمسٹ سے
دوا خریدنے کے لئے ہم دکان کے اندر گئے تو پنجاب کے اُس زمانے کے نئے نویلے
گورنر کھر صاحب سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ ہمیں دیکھ کر کچھ ٹھٹک سے گئے اور ازراہ
رعایا پروری فرمایا "آپ کو کہیں دیکھا ہے"۔ ہم نے عرض کی "جی ہاں ضرور دیکھا
ہو گا کسی زمانے میں آپ ایچیسن کالج میں ہمارے شاگرد ہوا کرتے تھے" ـــــ سو،
یہاں، شاگرد کے بھائی پر ہمیں جو تاؤ آیا تھا، وہ ہرن ہو گیا۔ باتوں سے معلوم
ہوا کہ تجارت کے سلسلہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک ہفتہ سے اوساکا کے
سب سے مہنگے ہوٹل میں پڑے سڑ رہے ہیں کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملا جس سے
بات چیت کر سکیں۔ ہم نے کہا "بھلے آدمی جاپان آنے سے پہلے کسی مناسب ٹریڈنگ
ایجنسی سے بات چیت کی ہوتی تاکہ وقت اور پیسہ ضائع نہ ہوتا"۔ جواب ملا "جی!
ذرا آنے کی جلدی تھی اس لئے چلے آئے"۔ ہم نے کہا "میاں! سچ کہتے ہو جس کے
پاس وافر پیسہ ہوتا ہے اسے ہر جگہ جانے کی جلدی ہوتی ہے"۔ چنانچہ ہم نے اپنی
بساط کے مطابق ان کی خاطر تواضع کی۔ مناسب لوگوں سے ان کا تعارف کروایا
بعد کو معلوم ہوا کہ وہ حضرات مزید تین ہفتہ یہاں قیام فرما رہے اور اس کے
بعد ٹھنڈے ٹھنڈے واپس سدھارے۔ رہا کاروبار! وہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔



جاپان کی سیر بہت ضروری تھی۔ وہ ہو گئی! ـــــ شیخ سعدی نے اپنی شیخ
برادری کے بارہ میں شاید کہا ہے "خرِ عیسٰی اگر بمکہ رود ...! معاف کیجیے!
بات سے بات نکلتی ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ جن دنوں کھر
صاحب کے دوبارہ گورنر بننے کی خبر گرم تھی ہمارے ایک شاگرد نے اطلاع دی کہ
کھر صاحب دوبارہ گورنر بن رہے ہیں مبارک ہو! ہم نے کہا خیر مبارک۔ مگر
چوں بیاید ہنوز کھر باشد کا مضمون نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہی ہوا جس بات کا
ڈر تھا۔ رستے میں اِک شیر کا گھر تھا۔

## ۸

استفسارات کا سلسلہ شروع ہوا تو عجیب و غریب استفسار موصول ہونے
لگے۔ ایک مولینا نے پوچھا کہ جاپان میں نکاح اور طلاق کا کیا سلسلہ ہے؟ ہم نے
جواب دیا یہ سوال ہم جیسے بے توفیقوں سے کرنا ہی عبث ہے، نکاح کی توفیق
ملی نہ طلاق تک نوبت پہنچی اب کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ معلوم ہوتا ہے
مستفسر اِس مسئلہ پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے دوبارہ خط لکھ مارا کچھ تو کہیے کہ
لوگ کہتے ہیں۔ ہم نے جواب میں پھر آئیں بائیں شائیں کی، مگر وہ حضرت بھی
نرگدا ثابت ہوئے، جب تیسری بار بھی ان کا اصرار موصول ہوا تو ہم نے ہتھیار
ڈال دیئے۔ اتفاقاً نکاح کی ایک بابرکت تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ
مِل گیا اور ہم نے بعجلت تمام اسے شرفِ قبول بخشا۔ اب تک جو ہم نکاح کی
تقریبات سے گریز کر رہے تھے اُس کی بڑی معقول وجہ تھی کہ ہمارے پیشرو



پروفیسر ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی صاحب کی روایت کے مطابق ایک دن، دن
دہاڑے ایک نوجوان اُن کے پاس تشریف لائے اور برضا و رغبت اسلام
قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ قبلہ شاہ صاحب نے اُنہیں کلمۂ شہادت پڑھا کر
مشرّف بہ اسلام کیا اور اپنی جیب سے شیرینی بھی تقسیم فرمائی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد ایک
نوجوان خاتون سر پر پلّو رکھے آنکھیں نیچی کئے قبلہ و کعبہ کے پاس حاضر ہوئیں کہ
بندی حاضر ہے مشرّف بہ اسلام فرمائیے، شاہ صاحب نے اسے بھی کلمہ پڑھایا۔
دو ہفتے کے بعد دونوں اکٹھے حاضر ہوئے کہ حضرت آپ نے کلمہ تو پڑھا دیا
اب دو بول بھی پڑھوا دیجیے۔ اب تو شاہ صاحب کے کان کھڑے ہوئے
کیونکہ قانون کے مطابق اُن کے پاس نکاح خوانی کے اختیارات نہیں تھے،
فرمایا آپ کو مسلمان ہوئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں کچھ دیر انتظار کیجیے،
اسلام کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کیجیے۔ میاں تو مسلم زیادہ ہی بے صبرے تھے
فرمانے لگے حضرت پہلے ہی کافی انتظار کھینچ چکے اب جلدی کیجیے۔ ہم تو مسلمان ہی
اِس لئے ہوئے تھے کہ اپنے شنتو طریق کے مطابق تو نکاح بہت مہنگا ہے،
دس پندرہ لاکھ ین مُفت میں کھُل جاتے ہیں، مسلمانوں کا مسئلہ سیدھا سادہ اور
سستا ہے دو چار چھوہاروں سے کام چل جاتا ہے۔ بسم اللہ کیجیے نیک کام
میں دیر کیسی؟

اِس واقعہ سے ہم نے عبرت پکڑ رکھی تھی اِس لئے نکاح کی تقریب میں

حاضر ہونے سے گریزاں رہتے تھے مبادا مہنگائی کے مارے ہوئے دُلہا دلہن
ہمارے گرد ہو جائیں کہ حضرت بسم اللہ کیجئے نیک کام میں دیر کیسی ؟

مگر جس نکاح کی تقریب میں شرکت کرنے کا وعدہ ہم نے کیا وہ ہمارے
شاگردوں کی خانہ آبادی تھی۔ دولہا بھی ہمارے شاگرد تھے اور دُلہن بھی چشم
بد دُور ہماری شاگرد تھیں۔ دو سال سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے کہ یک جان و
دو قالب ہیں۔ کلاس میں، کلاس سے باہر، جہاں بھی ہم نے اُنہیں دیکھا اکٹھے ہی
دیکھا۔ اِدھر گریجویشن کی تقریب ہوئی اُدھر نکاح کے انتظامات ہونے لگے۔

میاں صاحبزادے 'کاناز اوا' کے رہنے والے تھے اور بی دُلہن اوساکا
کی۔ ہمارے دستور کے مطابق تو بارات کو اوساکا آنا چاہیئے تھا مگر معلوم ہوا
کہ دو [۲] دن پہلے بی دُلہن کاناز اوا تشریف لے جا چکی ہیں نکاح کی بابرکت تقریب
وہیں ہو گی۔

آمد و رفت کا گاڑی کا ٹکٹ دولہا دلہن کی طرف سے موصول ہوا اور ہم
اپنے دیگر رفقاء کے ہمراہ گاڑی میں سوار ہونے کے لئے سٹیشن پر پہنچے۔ دیکھا کہ
آٹھ دس آدمیوں کا ایک اَور قافلہ بھی اس ڈبہ میں سوار ہوا ہے۔ قرائن سے
معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات بھی کسی شادی میں شرکت کے لئے شریکِ سفر ہیں۔
گاڑی روانہ ہوئی۔ بیس پچیس منٹ کے بعد ایک صاحب اُٹھے اور فرداً فرداً ہر ایک
سے جُھک جُھک کر علیک سلیک کرنے لگے، ہمارے پاس بھی تشریف لائے معلوم



ہوا کہ دُلہن کے والد گرامی ہیں اور بیٹی کی شادی میں شریک ہونے کے لئے
بطور مہمان تشریف لے جا رہے ہیں۔

کاناز اوا، اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو دولہا دُلہن دونوں سٹیشن پر ہمارے قدم
لینے کو موجود تھے۔ ہم نے دُلہن سے کہا بیٹی ! تمہیں تو مائیوں بیٹھنا تھا تم یہاں
کیوں پھر رہی ہو ؟ ارشاد فرمایا "دو دن سے ہم دونوں انتظامات میں مصروف
ہیں۔ ہم دونوں انتظام نہیں کریں گے تو اَور کون کرے گا ؟" اس علیک سلیک
کے بعد وہ ابّا حضور کے پاس گئیں اور نہایت گہری کورنش کے بعد گویا ہوئیں
"آپ کی بہت نوازش کہ آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے ہماری
شادی میں شرکت کے لئے وقت نکالا ...." ابّا حضور نے فرمایا "بیٹی ! کوئی
بات نہیں، مجھے تمہاری شادی میں شرکت کر کے بہت خوشی ہو رہی ہے ! تمہاری
امّاں کل شام خیریت سے تو پہنچ گئی تھیں ؟" —— ہم انگلیاں دانتوں میں دابے
یہ بصیرت افروز مکالمہ سُنتے اور سر دُھنتے رہے ! اسٹیشن سے نکلے اور سیدھے
ہوٹل پہنچے جہاں شادی کی سی چہل پہل نظر آتی تھی۔ معلوم ہوا کہ تین شادیاں
ہو رہی ہیں اور ہمارے میزبانوں کی شادی تیسرے نمبر پر ہے لہٰذا آرام
کیجئے اور انتظار کھینچئے !

شادیاں صرف ہوٹلوں میں ہوتی ہیں کیونکہ گھروں میں مہمانوں کی گنجائش
نہیں ہوتی۔ اور ٹھیکے پر ہوتی ہیں یعنی ہوٹل والے مہمانوں کی تعداد کے

مطابق معاملہ پہلے سے طے کر لیتے ہیں۔ رقم ادا کر دیجئے اور اطمینان سے شادی کے وقت تشریف لے آئیے ہر چیز تیار ملے گی۔ ع

کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھُواں کیا انگارہ

یعنی دلہن، دُلہن کا لباس، نکاح خواں، تحفے تحائف، کھانا اور مشاطہ!!

جن ہوٹلوں میں شادی کے انتظامات ہوتے ہیں وہاں اِس خدمت کے لئے خاص ملازم رکھے جاتے ہیں جو ہر کام بخیر و خوبی انجام دیتے ہیں۔ دولہا دلہن کی صرف جیب ہلکی ہوتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔

ایک بجے، دُلہن کی والدہ تشریف لائیں کہ بٹیا دلہن بن چکی اسے آشیرباد دیجئے۔ ہم گئے۔ بٹیا، شادی کا زرق برق کیمونو پہنے کمرہ میں کھڑی تھی اور دولہا میاں مہمانوں سے باری باری اس کا تعارف کروا رہے تھے۔ ہم نے بھی دعا دی کہ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ ماشاء اللہ بہت خوبصورت لگ رہی ہو — دُلہن نے جھٹ جُھک کر جواب دیا "کیا واقعی میں بہت خوب صورت لگ رہی ہوں؟ آپ کا ذوقِ نظر ہے ورنہ بندی — من آنم کہ من دانم!" اِس آشیرباد کے بعد ہم باہر نکلے۔ دولہا میاں سے پوچھا کہ "نکاح کب ہوگا؟" فرمایا "ابھی اِس رونمائی کے بعد — مگر یہ نکاح خواں بڑا سُست ہے ابھی تک دوسرے نکاح سے فارغ نہیں ہوا کچھوے کی اولاد!" —



نکاح خوانی کی تقریب میں شرکت کے لئے ہمیں خاص اجازت لینا پڑی کیونکہ اس میں دولہا دُلہن کے قریبی عزیزوں کے علاوہ کوئی اور شرکت نہیں کر سکتا اور سب کی کرسیاں پہلے سے مخصوص ہوتی ہیں — ہمارے لئے زائد کرسی کا بندوبست کرنا پڑا اور اس بندوبست سے بل میں صرف تین سو روپے کا اضافہ ہوگیا۔

سب لوگ بیٹھ چکے تو دُولہا دُلہن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کمرۂ نکاح میں داخل ہوئے۔ کمرہ کے غربی حصہ میں مندر کا سا ماحول پیدا کیا گیا تھا اور نکاح خواں صاحب، پنڈتوں کا سا لباس پہنے ہاتھ میں مورچھل لیئے منتظر تھے۔ دولہا دلہن آئے، پنڈت جی نے بآوازِ بلند کچھ ارشاد فرمایا اور ترنّم کے ساتھ کچھ وِرد فرماتے رہے اور دونوں پر وقفہ وقفہ سے مورچھل جھلتے رہے، گویا بلائیں دُور کر رہے ہیں۔ اس کے بعد شراب کا ایک ننّھا مُنّا جام بھرا۔ دولہا کو دیا اس نے ایک گھونٹ بھر کر دُلہن کو دے دیا۔ دلہن بی بی نے غٹا غٹ چڑھا لیا۔ چلیئے نکاح ہوگیا۔ ہم اپنے ساتھی سے کہا "یار یہ تو بہت ہی مختصر نکاح ہے بلکہ نکاح کا ذو اضعافِ اقل معلوم ہوتا ہے۔" کہنے لگے "آخر نکاح خواں بھی انسان ہے صبح سے دو نکاحوں کا عادِ اعظم نکال رہا تھا اب بیچارا تھک گیا ہے۔ کھانے کا وقت ہے!"

سب لوگوں نے دولہا دلہن کو مبارک باد دی اور اس کے ساتھ ہی اعلان

ہؤا کہ ہال نمبر تین میں کھانے کے لئے تشریف لے چلئے۔ پہنچے تو سب لوگوں کی نشستیں مخصوص تھیں اور ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہماری نشست پر ہمارا نام اُردو میں لکھا ہؤا تھا جو ظاہر ہے کہ دُلہن کے مُوئے قلم کا شاہکار تھا!

کھانا لگا ہؤا تھا مگر دولہا دلہن کا انتظار تھا کہ وہ تشریف لائیں تو کام و دہن کی آزمائش شروع ہو۔ اعلان ہؤا باادب باملاحظہ ہوشیار —— دولہا دلہن کی سواری بادِ بہاری آتی ہے۔ دونوں خراماں خراماں دست بدست تشریف لائے اور صدر مقام پر تشریف فرما ہوئے۔ کھانا سامنے رکھا تھا کچّی مچھلی کی بھینی بھینی خوشبو سے مشامِ جاں معطّر ہو رہا تھا۔ سامنے پڑے ہوئے کیکڑے کی مونچھیں ابھی تک ہل رہی تھیں۔ لوگ للچائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے کہ کب اِذنِ عام ہو اور وہ پل پڑیں مگر مہمانِ خصوصی نے اُٹھ کر تقریر شروع کر دی ع ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا —— ! ہمارے صدر شعبہ اِس تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے وہ کوئی تیس منٹ تک دولہا دلہن کے یونیورسٹی کے کارنامے بیان فرماتے رہے۔ ان کے بعد دوسرے مہمانوں کی باری آئی اور آخر قرعۂ فال ہمارے نام بھی نکلا کہ ہم بھی تقریر کریں۔ ہم نے اُردو میں مختصر سی تقریر کی کہ دولہا میاں نے امتحان میں تو بی گریڈ حاصل کیا ہے مگر دلہن اے گریڈ کی حاصل کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ بابرکت کرے۔ ترجمان ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلا یعنی ہماری تین منٹ کی تقریر



کا ترجمہ سات منٹ میں مکمل کیا اور اس کے بعد دیر تک تالیاں بجتی رہیں اور ہم ترجمان کی زبانِ فیض ترجمان کی داد دیتے رہے!

ایک صاحب نے جو ہمارے داہنے ہاتھ تشریف فرما تھے ہمارا ہاتھ زور سے دبایا اور فرمایا بہت بہت شکریہ آپ نے میرے بیٹے کے بارہ میں بہت اچھی تقریر فرمائی ہے۔ مَیں دولہا کا باپ ہوں!"

کھانا بہت لذیذ تھا۔ لوگ بڑے مزے سے کھاتے رہے ہم بھی اپنی بساط کے مطابق انصاف کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر اس کے باوجود ہماری ٹرے میں بہت کچھ بچ رہا۔

ابھی یہ آزمائش جاری تھی کہ ہوٹل کا ایک ملازم ہر ایک کے سامنے گتّے کا بنا ہؤا ایک ایک لنچ باکس رکھ گیا۔ یہ اقدام ہماری سمجھ سے بالا تھا ہم نے پڑوسی سے پوچھا اِس کا کیا مصرف ہے؟ جواب ملا کہ جو کچھ آپ نہیں کھا سکے وہ اِس میں ڈال لیجئے اور گھر جا کر تناول فرمائیے۔ ہم نے کہا ہم تو بھر پائے! پڑوسی نے اِس موقع کو غنیمت جانا اور ہمارا پس خوردہ ہماری اجازت سے اپنے لنچ بکس میں بھر لیا کیونکہ وہ اپنی ٹرے کے ساتھ پورا پورا انصاف فرما چکے تھے!

اس کے بعد ایک اَور خوش پوش اور خوش شکل ملازمہ تحائف کے انبار اُٹھائے حاضر ہوئی اور ہر ایک نشست کے ساتھ ایک ایک تحفہ رکھ گئی معلوم

ہوا یہ دولہا دلہن کی طرف سے شادی میں شرکت کے عوض شکریہ کے تحائف ہیں۔ رخصت ہوتے وقت ہم نے وہ تحفہ اُٹھایا تو خاصہ وزنی تحفہ تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ کون معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں۔ گھر پہنچ کر کھولا تو کانازاوا کی خاص شراب کی دو بوتلیں نکلیں ؏

اللہ تیری شان کے قربان جائیے!

اِس تقریب مبارک اثر کے بعد دولہا دلہن ہمیں رخصت کرنے کے لئے سٹیشن پر تشریف لائے۔ بی دلہن نے سادہ سا سکرٹ پہن رکھا تھا۔ ہم نے کہا "بٹیا وہ کیمونو کدھر گیا؟" ہنس کر گویا ہوئیں "وہ تو کرائے کا تھا۔ ہوٹل والوں کو واپس کر دیا ہے —— ہم پاکستانی تھوڑا ہی ہیں کہ شادی کے لئے بھاری کامدار جوڑا تیار کریں اور چار پانچ ہزار روپے مفت میں ضائع کر دیں۔ یہاں پانچسو روپے میں کیمونو ملتا ہے دو گھنٹے کے لئے کرائے پر لیتے ہیں اور اس کے بعد واپس کر دیتے ہیں کہ لو —— اُٹھا لو پاندان اپنا!" —— ہم چپکے ہو رہے کہ اِس بنتِ جاپان کی بات کڑوی ضرور تھی مگر تھی سچی اور کھلا لگتی! جاپانیوں نے صدیوں کے تجربہ کے بعد سبق سیکھ لیا ہے ہم نے ابھی تک نہیں سیکھا!

خدا معلوم یہ ہماری تقریر کا اثر تھا یا ترجمان کا کمال کہ کانازاوا کے ایک مقامی صحافی سٹیشن پر ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تشریف لائے اور



انٹرویو کے لئے درخواست کی۔ ہم نے کہا "میاں پوچھو کیا پوچھتے ہو؟"۔ حضرت کا سوال تھا کہ پاکستان کی شادی میں کیا کچھ ہوتا ہے؟ ہم نے کہا "یہی کچھ ہوتا ہے جو یہاں ہوا صرف تقریریں نہیں ہوتیں!"۔ حیرت سے بولے "سچ! بالکل تقریریں نہیں ہوتیں؟" ہم نے کہا ہاں! ہمارے ہاں دستور یہ ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا بولتا ہے لڑکی سُنتی ہے۔ نکاح پر مولوی بولتا ہے دولہا سُنتا ہے اور شادی کے بعد دونوں بولتے ہیں محلے والے سُنتے ہیں!" مگر صحافی کے پلّے کچھ نہیں پڑا۔

دوسرا سوال یہ تھا "کیا آپ کے ہاں بھی شادی کے موقع پر اسراف ہوتا ہے؟" ہم نے کہا اے شیخِ بے نماز تو اورا نہ دیدہ ای! تم نے ہماری شادیاں دیکھیں نہیں ورنہ اپنی شادیوں کو اسراف نہ کہتے! ہم لوگ تو ایسے موقعوں پر وہ چاؤ چونچلے اور بے جا خرچ اخراجات کرتے ہیں کہ تم جاپانی سُنو تو غش کھا جاؤ! شادی بیاہ کے معاملہ میں تو ہم خصوصًا بڑے خونخوار قسم کے "اقتصادی جانور" ہیں اور تمام اقتصادی ضوابط کی تکّا بوٹی کر دیتے ہیں!"

تیسرا سوال "اومی یائی" کے بارہ میں تھا۔ یہ لفظ مومیائی کے خاندان سے نہیں ہے۔ اِس کا مطلب ہے، دو خاندانوں کا آپس میں تعارف کروانا۔ یعنی وہی کام جو ہمارے ہاں رشتہ ناطہ والے انجام دیتے ہیں۔ جاپان

میں اکثر شادیاں "میاں بیوی راضی کیا کرے گا قاضی" کے عالمی اصول پر ہوتی ہیں مگر "اومی یائی" کی رسم بھی چلی جاتی ہے۔ لڑکا اور لڑکی اگر ایک دوسرے کو پسند بھی کر لیں تو کسی تیسرے آدمی کو درمیان میں ڈال لیتے ہیں وہ دونوں خاندانوں کو ایک میز پر اکٹھا کرتا ہے، لڑکا اور لڑکی بھی موجود ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خاندانی اسرار فاش ہوتے ہیں اور عام طور پر "اومی یائی" کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ جہاں لڑکا اور لڑکی پہلے سے ایک دوسرے کو نہیں جانتے وہاں دونوں خاندان اکٹھے ہوتے ہیں، کچھ دیر اکٹھے بیٹھتے، کھاتے پیتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکا اور لڑکی اُٹھ کر سیر کے لئے باہر نکل جاتے ہیں۔ اگر دونوں باہم سیر پر راضی ہو جائیں تو لڑکی والوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں کہ چلو اتنی پسندگی تو ظاہر ہو گئی کہ دونوں اکٹھے سیر کرنے پر راضی ہو گئے۔ اگرچہ بعض اوقات یہ سیر بھی کامیاب ثابت نہیں ہوتی! بہرحال "اومی یائی" کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اگر یہ تقریب کسی ہوٹل میں ہو تو اس کے اخراجات لڑکی والے برداشت کرتے ہیں۔ وہ "درمیانی آدمی" صرف اپنی فیس وصول کرتا ہے دونوں طرف سے برابر برابر! رشتہ ہو یا نہ ہو فیس برحق ہے! اگر رشتہ ہو جائے تو وہ "درمیانی آدمی" شادی میں مہمان خصوصی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ھیڈر شعبہ اِن بچّوں کی شادی میں اسی "اومی یائی" کے طفیل مہمانِ خصوصی تھے۔ اگرچہ پبلک کے پُرزور اصرار کے باوجود آپ نے کوئی



فیس وصول نہیں کی تھی! صرف اتنا ضرور ہُوا تھا کہ اُن کے تحفے میں دو بوتلوں کی بجائے بوتلوں کا پورا کریٹ بندھا ہُوا تھا جسے اُٹھانے کے لئے انہیں ٹیکسی کرائے پر لینا پڑی تھی ــــ اور یہ کریٹ ایسا پتھر بھی نہیں تھا کہ وہ اسے چُوم کر چھوڑ دیتے! آخر کا ناز ا وا کی مئے دو آتشہ تھی جس کی دُھوم چار دانگِ جاپان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے حصّہ کا تحفہ اپنے پڑوسی کو پیش کیا تو وہ آنکھیں مَل مَل کر اسے دیکھنے لگے کہ یہ نعمتِ غیر مترقبہ کہاں سے آکے دروازہ پر دستک دے رہی ہے!

صحافی صاحب کی صحافت "اومی یائی" تک آ کر ختم ہو گئی۔ ہم نے کہا "آپ نے جہیز کے بارہ میں کوئی سوال نہیں کیا؟" کہنے لگا "جہیز؟ یہ کس چڑیا کا نام ہے؟" ہم نے کہا "میاں تمیز سے بات کرو! یہ چڑیا کا نام نہیں لڑکی کے والدین کی کھال کھینچنے والے اوزار کو کہتے ہیں" ــــ تم کیا جانو تم کیا سمجھو بات کسی سودائی کی! تمہارے ہاں لڑکا لڑکی اپنا گھر نہیں بناتے؟" ــــ کہنے لگے "بناتے ہیں"۔ ہم نے کہا "تو سامان کہاں سے آتا ہے؟" مسکرا کر فرمانے لگے "بازار سے ــــ اور اس کا بِل لڑکا لڑکی ادا کرتے ہیں برابر آدھا آدھا ــــ" اگر دونوں کے والدین اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہیں تو لڑکا لڑکی ازراہِ مروّت اسے قبول کر لیتے ہیں! پابندی کوئی نہیں!" ہم نے صحافی کے توثّق سے یہی اندازہ لگایا کہ بچارا ٹھیک ہی کہتا ہوگا ورنہ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے

جس پر یقین آجائے؟

اس شادی میں شریک ہونے کے بعد ہمارا حوصلہ بڑھ گیا۔ ایک ڈاکٹر دوست کی شادی تھی اس نے دعوت دی۔ ہم نے قبول کرلی! بات یہاں تک رہتی تو بجا تھا مگر بات چل نکلی اور ہم اب تک سوچ رہے ہیں کہ دیکھیں کہاں تک پہنچے؟ صرف یہ قصور ہوا کہ دعوت میں پہنچ گئے اور تقریر کردی! اور اس تقریر دلپذیر کے ہاتھوں اب تک پریشان ہیں!

ڈاکٹر کی شادی میں ظاہر ہے بے شمار ڈاکٹر شامل تھے۔ کانوں کے، ہاتھوں کے، پاؤں کے، دل کے، دماغ کے دَورہ کے! ہر ایک نے اپنے اپنے خاص ہنر کی رُو سے دولہا میاں کا اپریشن کیا۔ ہم غلطی سے کہہ بیٹھے ہم زبان کے ڈاکٹر ہیں لہٰذا دولہا کو پانچ چھ زبانوں میں مبارک دیں گے۔ چنانچہ عربی، فارسی، انگریزی، اُردو، پنجابی اور جاپانی میں مبارک باد دی اور تالیوں کی گونج میں شاداں و فرحاں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ تقریب کے اختتام پر ایک بڑے میاں جو کسی تجارتی کمپنی کے سربراہ تھے تشریف لائے اور ہم سے ہمارا اَتہ پتہ پوچھا! ہم نے نہایت ادب سے اپنا کارڈ پیش کیا وہ لے گئے۔ دو تین روز بعد اُن کا ٹیلیفون آیا کہ مَیں اپنی بیوی کو لے کر حاضر ہونا چاہتا ہوں وقت دیجئے۔ ہم نے وقت دیا۔ تشریف لائے بیگم صاحبہ بھی ہمراہ تھیں۔ ہم نے کہا فرمائیے ــــــ فرمانے لگے ان کی زبان پر پچھلے آٹھ دس سال سے کچھ ورم سا ہے



جاپان کے ڈاکٹروں سے تو علاج کروا چکا ہوں مگر بے سُود، اب سوچا آپ غیر ملکی ڈاکٹر ہیں آپ کے تجربہ سے فائدہ اُٹھائیں!" ہم سُن ہو گئے کہ اب ان کو کیا جواب دیں؟ یہ حضرات تو کسی صورت میں ہماری معذرت قبول نہیں کریں گے ــــــ ہم نے فوراً اس کا حل سوچا۔ گھر میں ہمدرد والوں کی کارمینا پڑی تھی اس کی تین ٹکیاں دیں کہ یہ کھانے کے بعد چُوس لیا کیجئے اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی بے نیاز ہے اس نے شفا دے دی۔ وہ کوئی ہفتہ بھر کے بعد تشریف لائے تحفوں سے لدے پھندے! کہ آپ کی دوا نے تو معجزہ دکھایا ہے اب ان کی زبان بالکل ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کرسکیں یہ دو ہزار روپے کا حقیر سا تحفہ ہے قبول فرمائیے! ہم نے بصد دقّت اور منّت سماجت تحفہ واپس کیا کہ حضرت ہم پیسے لینے والے ڈاکٹر نہیں ہیں کسی فلاحی ادارہ کو دے دیجئے ــــــ وہ حضرت بھی شاید بُرے کو گھر تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے آپ نے اخبار میں ہماری حذاقت کے بارہ میں خط لکھ مارا۔ جب وہ خط اخبار میں چھپا تو یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات نے ہمارا ناک میں دم کردیا۔ جسے دیکھو زبان نکالے چلا آرہا ہے کہ اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی! تنگ آکر ہم نے ایک جاپانی دوست سے اسی اخبار میں اپنی حذاقت کے بطلان پر ایک خط لکھوایا جس میں ساری حقیقت بیان کردی مگر اس کے باوجود کئی لوگ اس خط کو ہماری کسر نفسی پر محمول کرتے ہوئے وقت مانگ

لیتے ہیں اور شاید ہمارے جاپان سے واپس جاتے وقت تک مانگتے رہیں گے!
اور ہنوز یان کے ڈاکٹر!!

شادی بیاہ کی بات تو لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کے زمرہ میں آتی ہے مگر ہم سوچ رہے ہیں کہ دوسری بات کیسے بیان کریں جو اس سے بھی زیادہ برحق ہے اور وہ ہے موت فوت!! آخر جاپانی مرتے بھی تو ہیں پیشتر ازیں کہ پاکستان سے کوئی صاحب اس موضوع پر پیش از مرگ واویلا کریں کیوں نہ پہلے ہی اس قرض سے سبکدوش ہو جائیں! عام جاپانی لوگ اکبر الہ آبادی کے مصرعہ کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر کی دُم سے چمٹے ہوئے ہیں یعنی گھروں پر مرنے کی بجائے ہسپتالوں میں مرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور ہسپتال والے بھی ایسے ظالم ہیں کہ جب تک اپنے تمام آلاتِ کشاورزی آزما نہیں لیتے مرنے والے کو مرنے نہیں دیتے۔

جاپانیوں کی اوسط عمر ہم پاکستانیوں کے مقابلہ میں صرف تیس برس زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے تعلقات حضرت عزرائیل سے کشیدہ ہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ حفظانِ صحت کے اصولوں پر سختی سے کاربند ہیں اور کھانے پینے (یعنی پانی پینے) کے معاملہ میں حد سے زیادہ محتاط ہیں — بیماری کے معاملہ میں حد سے زیادہ زکی الحس ہیں۔ ذرا سی تکلیف ہو تو ہسپتال کی طرف دوڑتے ہیں ہماری طرح توکّل کی خاکِ شفا نہیں پھانکتے! ظاہر ہے کہ مرض کو



ابتدا میں پکڑ لیں تو انتہا تک نہیں پہنچتا اور وہ نتیجہ جو ہمارے ہاں ذرا جلدی نکل آتا ہے جاپان میں ذرا دیر سے نکلتا ہے! اس بات سے جاپان کا ایک طبقہ بہت نالاں ہے اور وہ طبقہ ہے تجہیز و تکفین کا کاروبار کرنے والوں کا!

ہمارے ایک پڑوسی کوئی چار برس سے سرطان کا شکار تھے۔ انتقال پُر ملال سے دو دن قبل ڈاکٹروں سے خلافِ دستور یہ فرمائش کی کہ خدا کے لئے اطمینان سے مرنے دو اور مشینوں کی مشقِ ستم ختم کرو۔ مجھے گھر بھیج دو کہ میں آخری سانس تو سُکھ سے لے سکوں۔ چنانچہ اُن کی آخری خواہش پُوری کر دی گئی۔ وہ گھر آ گئے اور چار سال کے بعد گھر پہنچ کر اُن کی حالت میں نمایاں تغیّر پیدا ہونے لگا۔

ہم عیادت کے لئے حاضر تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور مریض کو ہنستا بولتا دیکھ کر بہت پریشان ہوئے! ہم سمجھے کوئی ڈاکٹر صاحب ہونگے مگر بعد کو معلوم ہوا کہ "آخری کاروبار" والے تھے اور مریض کی سنبھلی ہوئی حالت دیکھ کر بہت مایوس ہوئے تھے!! مگر اُن کا آخری وقت آ چکا تھا اور سنبھالا محض چراغ کی لو بھڑکنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ اگلے روز وہ آنجہانی ہو گئے۔ وہی صاحب جو پچھلے روز بہت مایوس لوٹے تھے شاداں و فرحاں، ساماں سے لدے پھندے تشریف لائے اور فرمایا "اِس بُڈھے نے چار سال انتظار کھچوایا!" گویا وہ سرطان کی خبر پاتے ہی گاہک کے گرد ہو گئے تھے!

ان لوگوں نے دیکھتے دیکھتے اُن کے پُورے گھر کو کفن پہنا دیا اور ماحول کو اتنا غم ناک بنا دیا کہ افسردگی خواہ مخواہ دل و دماغ پر چھانے لگی۔ اگربتّیاں روشن کر دیں۔ آنجہانی کی تصویر کے گرد سیاہ پھولوں کا حاشیہ لگا دیا اور اس کے سامنے جیبی سائز کی عبادت گاہ رکھ دی اور عبادت گاہ کے ارد گرد شراب، پھل اور کھانے سجا دیئے۔ مرنے والے کی تمام نشانیاں کمرہ میں سجا دیں اور فرش فروش کر کے مرنے والے کے لئے بے داغ ماحول پیدا کر دیا۔ ہم بھی تعزیت کے لئے حاضر ہوئے اور کمرہ کا ماحول دیکھ کر افسردہ ہوئے اور آنسو بہانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

جلانے والے آئے اور اپنی خاص گاڑی میں نعش رکھ کر لے چلے۔ رونا دھونا ہوا نہ کہرام مچا۔ بڑے میاں چُپکے سے سجی سجائی گاڑی میں آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ اور 'سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ' والا مصرع ہماری عبرت کے لئے پیچھے چھوڑ گئے۔

یہ جنازہ بردار گاڑیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ کار چوبی وین ہوتی ہے جس کی چھت مندر کی طرح ہوتی ہے اور پیچھے محراب نما دروازہ بنا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ہم نے جھانک کر نہیں دیکھا کہ مُردے کی ضیافتِ طبع کے لئے کیا کچھ ہوتا ہے۔ مگر اس بارہ میں ایک بار ایک فرانسیسی کارٹونسٹ کا کارٹون چھپا تھا جس میں جنازہ وین پر ٹی وی کا اینٹینا بھی لگا ہوا تھا۔ اندر شاید ٹی وی بھی لگا ہوتا ہوگا۔



واللہ اعلم بالصّواب۔

شام کو بڑے میاں کی راکھ سفید براق کپڑے میں لپٹے ہوئے چھوٹے سے ڈبّہ میں واپس آئی اور اگلے روز وہ راکھ بڑی سادگی سے خاندانی قبر میں دفن کر دی گئی ——— جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے!

یہ ساری دَوڑ دُھوپ کمپنی والوں نے کی اور بڑے میاں کے ورثاء نے ایک خاصے وزنی چیک پر دستخط کر کے اپنی انسانی انرجی کو ضائع ہونے سے بچائے رکھا!

نہ وہ نوبت آئی کہ ؎

مُٹھیوں میں خاک بھر کر دوست آئے بہرِ دفن
زندگی بھر کی محبّت کا صِلہ دینے لگے

اور نہ ہی تیسرا، چوتھا اور چالیسواں ہوا۔ اگلے سال "رُوحوں کے میلہ" تک چُھٹی ہو گئی۔ جب اپریل میں رُوحوں کا میلہ ہوگا لوگ پھول، پھل اور شراب لے کر خاندانی قبر پہ حاضر ہوں گے اور بڑے میاں کی خدمت میں اُن کی پسندیدہ شراب، ان کے پسندیدہ کھانے اور اُن کے پسندیدہ پھل پیش کریں گے اور اگلے روز بچّے وہ سب کچھ سمیٹ سماٹ کر واپس لے آئیں گے کہ دادا ابّا نے بھیجے ہیں۔ کھاؤ اور عیش اُڑاؤ۔ رات کو رُوحوں کا میلہ لگے گا لوگ ناچیں گائیں گے اور اگلے برس واپس آنے کے لئے یہ ہائیکو گنگناتے ہوئے لَوٹ جائیں گے ———

روحوں کے میلہ کا رقص اور اس کے بعد
صنوبر کی سرسراتی ہُوا
اور کیڑوں پتنگوں کے گیت !!

تعزیت کے لئے جانا بھی سستا نہیں کافی مہنگا پڑتا ہے کیونکہ حسبِ تعلّقات پیسے بھی دینا پڑتے ہیں۔ سب لوگ کالے تعزیتی لفافے میں کچھ رقم بند کر کے لواحقین کے سپرد کرتے جاتے ہیں اور وہ لوگ اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتے اور حساب چُکاتے ہیں۔

جن آنجہانی پڑوسی کا ہم نے ذکر کیا وہ سامنے کے مکان میں رہتے تھے اور اُن کے پوتے ہماری چھوٹی بچّی کے ہم جماعت تھے۔ لہٰذا بچّوں کا آنا جانا بھی تھا۔ اِس ناطے سے ہم اُن کے ہاں عیادت کے لئے بھی پہنچے اور تعزیت کے لئے بھی! مگر اس سے کچھ عرصہ قبل ایک اَور پڑوسی کا انتقال ہُوا ہم نے اپنے ہمسائے امریکی پروفیسر فارسی سے کہا آئیے ذرا تعزیّت کے لئے چلیں۔ فرمانے لگے "کوئی تک نہیں بنتی، دوسرے مکان تک تو ٹھیک ہے ان کا مکان تیسرے نمبر پر ہے!" —— ہم نے سوچا یہ امریکی تو ویسے ہی بڑے بے رحم ہوتے ہیں دوسرے ہمسائے چینی پروفیسر چن سے درخواست کی کہ چلیئے ہمدردی کے دو بول کہہ آئیں —— اُن کا جواب بھی وہی تھا کہ تیسرا مکان ہے لہٰذا جانا نہیں بنتا۔ تنگ آکر اپنے ایک جاپانی رفیقِ کار کو فون کیا کہ مرگ



کا موقع ہے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ جواب ملا آپ کے امریکی اور چینی ہمسائیوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہے یہ سب کچھ انہوں نے جاپان میں رہ کر سیکھا ہے اپنے ساتھ درآمد کر کے نہیں لائے! اِس کے باوجود ہماری اسلامی تربیت نے جوش مارا اور ہم تعزیت کے لئے چلے گئے۔ مرنے والے کے لواحقین نے ہمیں اجنبی نگاہوں سے دیکھا کہ یہ کون چلا آرہا ہے؟ ہم کچھ دیر سر جُھکائے خاموش بیٹھے اور سوچتے رہے کہ کس سے تعزیت کریں —— ان لوگوں میں سے کسی نے التفات نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد ہم اُٹھے اور توشۂ عاقبت میں حقیر سا اضافہ کر کے گھر واپس آگئے!

جہاں التفات ہُوا تھا وہاں ہم نے تھوڑی سی رقم بھی پیش کی تھی کہ رسم دنیا بھی، موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔ اور اس رقم نے دو سال تک آنجہانی کے عزیزوں رشتہ داروں کو چین سے نہیں سونے دیا۔ پہلے تو وہ انتظار کرتے رہے کہ ہم فوت ہو کر انہیں حساب چُکانے کا موقع دیں گے مگر جب ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحیح سلامت واپس پاکستان روانہ ہونے لگے تو اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ بی امّاں تشریف لائیں اور ایک خاصا قیمتی تحفہ ہمیں عنایت فرمایا۔ ہم نے کہا اِس کی کیا ضرورت تھی؟ فرمانے لگیں "ضرورت تو تھی آپ نے بڑے میاں کی وفات پر ہمیں پیسے جو دیئے تھے یہ تحفہ اُس کے جواب میں ہے!" چنانچہ ہم نے وہ جوابی تعزیتی تحفہ یہ سوچ کر رکھ لیا کہ

اگر ہم انکار کریں گے تو بی اماں حساب نہ چکانے کی خلش لے کر سدھار جائینگی
اور مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گی !

---

یہ لوگ مرنے والوں کو جلاتے ہیں کسی زمانہ میں دفن بھی کیا کرتے
تھے۔ جب سارا جزیرہ قبروں سے بھرنے لگا تو جلانے پر آ گئے! اب صرف
مُردہ کی خاک، خاندانی قبر میں گاڑ دیتے ہیں۔ یہ خاندانی قبر مشترکہ قبر ہوتی ہے
جس میں ایک ہی خاندان والے دفن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ گھروں میں اُن
کے ناخن اور بال کی نشانیاں رہ جاتی ہیں کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی کیڑوں کی
غذا بن جاتی ہیں!



## ⑨

ہمارے دوست ارشاد حسین کاظمی نے مدّتیں گزریں ہمیں ایک صدری غزل
سُنائی تھی جو غالباً شہزاد احمد کی تھی کہ ؎ پھرتی ہیں شہر شہر پریشان لڑکیاں ۔
کیوں ڈھونڈتی نہیں مجھے نادان لڑکیاں ! — ہمیں جاپان آنے سے پیشتر اس
غزل میں شہزاد احمد کی شاعرانہ تعلّی کے سوا، اور کچھ نظر نہ آتا تھا اور ہم زیادہ سے
زیادہ یہی سمجھتے تھے کہ ایک خوبصورت شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی
نرگسیّت کو نمایاں کیا ہے۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ شہزاد احمد نے اس شعر میں
پاکستانی لڑکیوں کا نہیں بلکہ جاپانی لڑکیوں کا ذکر کیا تھا۔

اس مُلک میں دو چیزیں بہت افراط سے پائی جاتی ہیں۔ موٹر کاریں اور
لڑکیاں۔ لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے کہیں زیادہ ہے اور شادی کے مسائل ان
سے بھی کہیں زیادہ! لڑکوں کا دماغ آسمان پر ہے۔ ایک ایک کے پیچھے کئی کئی

پڑی پھرتی ہیں مگر لڑکے ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے ۔ مگر جب مکھی بیٹھ جاتی ہے تو ایسی بیٹھتی ہے کہ ناک بٹھا دیتی ہے ۔ یہاں لڑکے کے لئے صرف یہ خصوصیّت کافی ہے کہ "اللہ میاں کا بنایا ہوُا ہو"، مگر لڑکے اللہ میاں کی بجائے میکس فیکٹر کی بنائی ہوئی لڑکیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ اس لئے یہ مخلوقِ خدا، دنیا بھر کے زیبائشی اداروں سے بن سنور کے اِس توقّع پر نکلتی ہے کہ کہیں تو ہوگا شبِ سُست موج کا ساحل ۔ مگر ہر کسی کو آسودۂ ساحل ہونے کا اعزاز نہیں ملتا ۔ کچھ منجدھار میں رہ جاتی ہیں اور کچھ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا کے بموجب دلہن بنتی بنتی دیوار کے دوسری طرف اُتر جاتی ہیں ۔

سب سے زیادہ حیرت اِس بات پر ہے کہ اخباروں میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہار نظر نہیں آتے ۔ ورنہ یہ ہو کہ سارے کا سارا اخبار ضرورتِ رشتہ سے بھر جائے اور خبریں محض ضمیمہ کے طور پر شائع ہوُا کریں ۔ اِس کمی کو ٹی وی والے پورا کرتے ہیں ۔ ہفتہ میں ایک بار ایک پروگرام Match Making کے نام سے ہوتا ہے ۔ ٹی وی والے، لڑکوں اور لڑکیوں سے علیحدہ علیحدہ اُن کا معیار پوچھتے ہیں اور اگر کسی لڑکے اور لڑکی کے معیار میں مطابقت ہو تو خفیہ طور پر ان دونوں کو سٹیج پر بلاتے ہیں ۔ لڑکا دائیں دروازہ سے داخل ہوتا ہے ۔ لڑکی بائیں دروازہ سے داخل ہوتی ہے ۔ سٹیج کے درمیان میں پردہ ہے جس کی وجہ سے وہ دونو ایکدوسرے کو دیکھ نہیں سکتے ۔ ایک صاحب لڑکے کا انٹرویو لے رہے ہیں جو لڑکی سُن رہی



ہے ۔ ایک صاحب لڑکی کا انٹرویو لے رہے ہیں جو لڑکا سُن رہا ہے اور تماشائی دونوں کی باتیں سُن کر محظوظ ہو رہے ہیں ۔ پھر پردہ اُٹھتا ہے، دونو ایکدوسرے کو دیکھتے ہیں، ملتے ہیں، باتیں کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سٹیج سے اُتر جاتے ہیں ۔ قریبًا ننانوے فیصد جوڑے ایک دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں ۔ بڑا دلچسپ پروگرام ہوتا ہے جو ہم جیسے پُرانے شادی شدہ اور عیالدار (اور مسلمان) آدمی بھی بڑے شوق سے دیکھتے ہیں ۔ مگر پچھلے ہفتے جو ڈرامہ ہوُا اس کا ملک بھر میں چرچا ہے اور ہفتہ بھر گزرنے کے بعد بھی اخبارات میں کالم کے کالم سیاہ ہو رہے ہیں ۔ ہوُا یوں کہ اسی طرح ایک جوڑا سٹیج پر بلایا گیا ۔ لڑکے اور لڑکی کا انٹرویو ہوُا ۔ لڑکی، جاپان کی ایک مشہور فنکارہ تھی اور لڑکا مشہور موسیقار تھا ۔ دونوں کا معیار یہ تھا کہ شریکِ زندگی کو مشہور و معروف شخصیّت ہونا چاہیئے ۔ خوب باتیں ہوئیں ۔ لڑکی خوب بن سنور کر آئی تھی ۔ لڑکا بھی بال بال موتی پروئے موجود تھا ۔ مگر جب درمیان کا پردہ اُٹھا تو دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مسکرائے، مصافحہ کیا اور سٹیج پر ہی ایک دوسرے سے لپٹ گئے ۔ دونوں پہلے سے میاں بیوی تھے اور کچھ عرصہ سے دونوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی اور دونوں دوسری شادی کے خواہش مند تھے ۔ مگر اس ڈرامہ نے اُن کی صلح صفائی کروا دی، اب سُنا ہے دونوں ہنسی خوشی رہ رہے ہیں اور اپنی شادی توڑنے کا ارادہ ترک کر چکے ہیں ۔

اخبارات میں چرچا اِس بات کا ہے کہ یہ کھیل دانستہ کھیلا گیا ہے یا نادانستہ۔ دونوں کا بیان ہے کہ نادانستہ۔ اور ٹی وی والے خاموش ہیں ع اور اس طرفہ تماشے پر خدا خاموش ہے۔

---

ہمارے ایک پاکستانی طالب علم، پچھلے ہفتے ہمیں ملنے کے لئے تشریف لائے تو ضمیمہ کے طور پر ایک خاتون بھی ہمراہ تھیں۔ آپ نے تعارف کروایا کہ "یہ خاتون ہمیں بہت پسند کرتی ہے اور ہماری جدائی ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتی اس لئے ہم اِسے اپنے آپ سے جُدا نہیں ہونے دیتے۔" ہم نے کہا میاں! یہ تو اُدھر کا حال ہے کچھ اپنی بھی کہو۔ آخر تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ فرمایا "ابھی تک تو آگ اُدھر ہی لگی ہوئی ہے اس لئے ہم محض اُس کی خاطر اسے ساتھ ساتھ چپکائے پھرتے ہیں۔" چنانچہ ہم نے بزرگانہ حقوق سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میاں صاحبزادے کو محبّت کے فلسفہ اور خاص طور سے جاپانی لڑکیوں کی محبّت کے فلسفہ پر لکچر پلایا کہ میاں! تم خاندانی طور پر سیّد ہوتے ہو اور پھر سرزمینِ پاک کے اس حصّہ سے تعلّق رکھتے ہو جسے پشاور کہتے ہیں گویا بہت ہی سیّد ہو، اِس لڑکی کی محبّت پر مت جاؤ یہ تو ہر اُس لڑکے سے محبّت کرتی ہے جس میں شوہر بننے کی ذراسی بھی صلاحیّت دیکھتی ہے۔ تم اِس کو مت دیکھو اپنے آپ کو دیکھو۔ ہمیں شادی پر اعتراض نہیں۔ اِسے کلمہ پڑھاؤ اور دو بول پڑھوالو —— مگر



سوچ سمجھ کر سے

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

مگر ان کے سر پر سنیچر سوار تھا، کچھ ناراض سے ہو کر چلے گئے اور آخری خبریں آنے تک ابھی تک اُس صاحبزادی کا دل رکھنے کی خاطر، اُس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ اللہ اُن کے ساتھ ہو۔

یہ مضمون بہت ہی مرغوب مضمون ہے اور خاص طور پر جوان چھڑے چھانٹ طالب علم تو اِس مضمون کو بڑی رغبت سے پڑھتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ یہ خاتون جو اُوپر سے بہت ہی نیچے، اور نیچے سے بہت ہی اُوپر قسم کا لباس پہن کر کولہے مٹکاتی اور دیدے گھماتی پھرتی ہے، شادی کے بعد بھی یہی کچھ کرے گی اُس وقت اُس کے ستر کو ڈھانکنے کے لئے کہاں کہاں پھاہے رکھو گے؟ تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم۔ مگر دوسرے بھی اس سے مامون اور محفوظ نہیں ہیں۔ ہمارے ایک بھارتی دوست ہیں بڑے سُلجھے ہوئے، پڑھے لکھّے! جاپان میں آئے تو پتنی جی بھی ساتھ تھیں اور دو خوبصورت گول مٹول سی بیٹیاں بھی! ایک دن سمندر کے ساحل پر کیمرہ لٹکائے سَیر کرتے پھر رہے تھے کہ ایک خاتون جو تیراکی کا لباس پہنے ہوئے تھیں، پانی میں شرابور ہنستی مسکراتی تشریف لائیں اور نہایت بھولپن سے فرمایا "کیا آپ میری تصویر نہیں کھینچیں گے؟" حضرت نے تصویر کھینچی اور پھر خود کھنچے

اوراب اُس خاتون اوراُس کے دو بچّوں کی گاڑی کھینچ رہے ہیں۔ اپنے دیس سے ناتا ٹوٹا، پرائے دیس میں رہتے ہیں۔ کمرہ میں اُن بہت ہی خوبصورت بیٹیوں کی تصویریں لگا رکھی ہیں، بیڈ روم میں موجودہ بیگم کی وہی تصویر آویزاں ہے جس کا کیا دھرا بُھگت رہے ہیں۔ ہم نے بیٹیوں کے بارہ میں پوچھا تو آنکھیں بھیگ گئیں اس لئے ہم خاموش ہوگئے، آپ نے خاموشی سے اپنا پیگ اُٹھایا اور غٹا غٹ پی گئے، اور یہ عمل اتنی بار دُہرایا کہ جب ہمیں گھر کے دروازے تک رخصت کرنے کے لئے آئے تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ اپنے پاؤں واپس نہیں جا سکیں گے۔

ہم نے اس سیّد زادہ کو یہ بات بھی سُنائی مگر سیّد زادوں پر اثر ذرا دیر سے ہوتا ہے بلکہ نہیں ہوتا، اقبال کی بات بیکار ہوجاتی ہے تو ہم کس باغ کی مُولی ہیں؟

خواتین کا لباس گرمیوں میں چار گرہ کا ہوتا ہے۔ حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب! اور سردیوں میں گز بھر کا۔ وہ بھی موسم کی مجبوری ہے ورنہ یہ بناتِ جاپان تو ٹیکسٹائل ملوں کا دیوالہ پٹوا دیں۔ مگر شریف لوگ یہاں بھی بہت شریف ہیں۔ پُرانے تہذیبی ورثے کے زیاں پر بہت متشوّش ہیں۔ اِن امریکی چونچلوں کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے صرف جنرل میکارتھر کو دعائیں دیتے ہیں!

ذرا غور فرمائیے کہ اِس قوم کا قومی لباس کیمونو تھا۔ کیمونو میں خاتون کا جسم اُوپر سے نیچے تک بالکل ڈھپ جاتا ہے۔ پاؤں کی جرابیں بھی کیمونو کا حصّہ ہیں



اور اُسی رنگ کی ہوتی ہیں جس رنگ کا کیمونو ہو۔ چہرے پر پاؤڈر کی اتنی گہری تہ ہوتی ہے کہ اصل خد وخال نظر نہیں آتے گویا یہ بھی ایک قسم کا نقاب ہوتا ہے۔ سر کے بال گوندھے ہوئے اور پیچھے جُوڑا، ہاتھوں میں باریک کپڑے کے دستانے! چال میں ایک خاص وقار اور رکھ رکھاؤ، آنکھیں جُھکی ہوئی۔ یہ سب کچھ کیمونو کے ساتھ لازم وملزوم تھا۔ مگر ان میکارتھروں نے پہلے ان کا کیمونو اُتروایا، پھر ان کی چال بدلی اور آنکھوں میں بے حیائی کا بارُود بھر کر چھوڑ دیا۔ تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم مری گردن پر۔

نئی تہذیب آگئی، پُرانے دَر وخال مٹ گئے۔ نوجوان نسل عجیب بے یقینی اور گومگو میں ہے۔ تہذیبی ورثہ پاؤں پکڑتا ہے اور نئی تہذیب باہیں پھیلائے کھڑی ہے۔ ہر اک سے پُوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟ بیگم ریاض الدین کا خیال ٹھیک ہے کہ یہ صنعتی ترقی کی پہلی قیمت ہے ؎

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ!

مگر شاید ہمارا خیال بھی ٹھیک ہے کہ یہ جنرل ٹوجو کی شکست کا خمیازہ ہے جو اُس کی قوم بُھگت رہی ہے!

---

اخبار میں ہر روز MANPOWER نامی ایک ادارہ کا اشتہار نمایاں طور پر

چھپتا ہے جس کا عنوان ہے کہ "MANPOWER BELIEVES IN WOMAN POWER"
یعنی ہم عورتوں کی قابلیتّوں پر اعتقاد رکھتے ہیں لہذا اگر خواتین ملازمت کی
خواہش مند ہیں تو ہم سے رجوع کریں۔ چنانچہ خواتین کی قابلیّتیں آپ کے
استفادہ کے لئے درج کرتے ہیں :

۱۔ ایک بار کے لئے خادمہ کی ضرورت ہے۔ عمر بیس سے تیس کے درمیان
خوبرو ہونا ضروری ہے! معاوضہ پانچ ہزار ین یومیہ۔ اوکاتِ کار
صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک (تقریباً ڈیڑھ دو سو روپے یومیہ)

۲۔ ایک کلب کے لئے ہوسٹس کی ضرورت ہے۔ عمر بیس سے پچیس برس۔ جسم
متوازن مسکراہٹ دلنواز۔ پیمائش سٹینڈرڈ۔ تیراکی کے لباس میں
انٹرویو کے لئے تشریف لائیں۔ معاوضہ دس ہزار ین سے بیس ہزار
ین یومیہ۔ اوقاتِ کار شام چھ بجے سے صبح ایک بجے تک۔ (تقریباً
ساڑھے چھ سو روپے یومیہ)

۳۔ خوبصورت آنکھوں والی خواتین کی ضرورت ہے۔ جلدی کیجیئے ہمارے
ٹی وی کمرشل کی تکمیل آپ کے نہ ہونے سے رُکی ہوئی ہے۔ معاوضہ
حسبِ قابلیت۔

۴۔ ایلویٹر پر کام کرنے کے لئے خوبصورت لڑکیوں کی ضرورت ہے۔
مدّتِ ملازمت پانچ سال۔ معاوضہ معقول۔



۵۔ حُسن پر کبھی زوال نہیں آتا۔ اس لئے اگر آپ عمر کے اس حصّہ میں ہیں
جو عام طور پر زوال کا حصّہ سمجھا جاتا ہے تو احساسِ کمتری میں مبتلا
ہونے کی ضرورت نہیں ہم آپ کو معقول معاوضہ دیں گے۔ تشریف لائیں۔

۶۔ آپ اپنی شرمیلی مسکراہٹ کی قیمت خود لگائیے ہم ہر قیمت پر خریدنے
کے لئے تیار ہیں۔ جلدی کیجیے۔

یہ تو ہوئیں خواتین کی قابلیّتیں۔ اب ذرا نمونہ کے طور پر اشتہاروں کا مزہ بھی چکھ لیجئے:

۱۔ گھڑی وہ ہے جو آپ کو آپ کی محبوبہ سے صحیح وقت پر ملائے تصور کیجیے
کہ وہ آپ کے انتظار میں کھڑی ہے اور آپ کی گھڑی سُست ہے۔
محض ذرا سے پیسے بچانے کے لئے آپ نے کتنے قیمتی لمحات ضائع کیئے؟
..... فلاں گھڑی خریدیئے۔

۲۔ "رات!
برف اور چاند!!
خاموش ـــــ مدہوش ـــــ فضا"
یہ محض لفظی شاعری ہے ـــــ مگر حقیقی شاعری فلاں وِسکی کے ایک
گلاس میں ہوتی ہے۔
گلاس میں شاعری ـــــ فلاں وِسکی"

۳۔ ایک دلنواز مسکراہٹ والی خاتون کی متحرک تصویر! فرماتی ہیں: میرے

ہونٹوں میں زندگی ہے!

مگر چکھ کے دیکھئے میرے ہونٹوں پر ابھی تک فلاں پڈنگ کی شیرینی
بھی موجود ہے !!

۴- تین خوبرو لڑکیاں منی سکرٹ پہنے اُچھلتی کودتی پھر رہی ہیں، وقفہ وقفہ سے پھریری لیتی ہیں اور انڈرویئر دکھاتی ہیں —— آخر میں آواز آتی ہے۔ جتنی خوبصورت ٹانگیں اُتنا ہی خوبصورت انڈرویئر !!

۵- ایک پری چہرہ خاتون اللہ میاں سے سوال کرتی ہے :

"اے اللہ میاں ! کیا تم فلاں قسم کے بسکٹ بنا سکتے ہو—؟"

اللہ میاں کی آواز آتی ہے "نہیں"

وہ خاتون ان بسکٹوں کا ڈبّہ اُٹھا کر دکھاتی ہے "اگر سیکھنا چاہتے ہو
تو فلاں کمپنی والوں سے سیکھو"

غرض اشتہار کیا ہیں کوکا کولا کلچر کی مُنہ بولتی تصویر ہیں۔ اور یہ کوکا کولا کلچر جہاں بھی پہنچا ہے وہاں یہی کچھ ہوتا ہے ع جس گھر سے سر اُٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا۔

ٹی وی کمرشل تو باقاعدہ دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ٹی وی صبح ۵ بجے سے شروع ہو کر رات ۲ بجے تک مسلسل چلتا ہے۔ جاپان میں ۴۳ ٹیلیوژن نٹ ورک ہیں۔ سب کی آمدنی کا ذریعہ یہی کمرشل سروس ہے اور پروگرام بھی ایک سے ایک بڑھیا اور قابل دید اور قابل سماعت !! ایک ٹی۔ وی آرٹسٹ اتنے مقبول ہوئے



کر اپنے حلقہ سے پارلیمنٹ کے ممبر چُنے گئے۔ موصوف نے اتنے زیادہ ووٹ حاصل کئے کہ جاپان میں انفرادی طور پر ووٹ حاصل کرنے کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ میکی صاحب کی کابینہ میں نائب وزیر تھے اور نائب وزیر بھی ایک بہت اہم محکمہ یعنی محکمۂ دفاع کے! کسی تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تو نشے میں تھے، مُنہ سے بھبکے آ رہے تھے اور قدم ڈگمگا رہے تھے۔ پریس والوں کو اللہ ایسا موقع دے۔ سوال پر سوال کرتے چلے گئے اور قبلہ بنتِ چاول کے نشہ میں کچھ کے کچھ جواب دیتے چلے گئے۔ اگلے روز یہ ساری روداد با تصویر اخباروں میں چھاپ دی گئی۔ ہم نے پڑھی تو سوچا کہ اخبار والوں کے بُرے دن آ گئے ہیں جو ایک وزیر کے بارہ میں ایسی باتیں چھاپ رہے ہیں۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ اپوزیشن والوں نے حکومت کو رگیدنا چاہا تو وزیر موصوف نے فرمایا کہ اخبارات نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا حق ہے اور میں نے جو کچھ کیا، کہا وہ میرا حق ہے۔ اپوزیشن والے آخر بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کیوں کر رہے ہیں؟

کچھ دوستوں نے ذاتی طور پر سمجھایا کہ آپ حکومت کے عہدیدار ہیں اس لئے ٹیلیوژن پر اداکاری کے جوہر نہ دکھایا کیجئے! حضرت کو غصّہ آ گیا فرمایا ٹیلیوژن پر اداکاری کرنا میرا پیشہ ہے اور اس اداکاری کی وجہ سے ہی عوام نے مجھے اپنی حمایت سے ڈائٹ کا رُکن منتخب کیا ہے اور آئین کے مطابق مجھ پر اپنا پیشہ چھوڑنے کی کوئی پابندی نہیں۔ رہی وزارت، تو وہ میری مرضی کے خلاف مجھے دی گئی ہے

اور مَیں محض پارٹی کے احکامات کی تعمیل میں یہ بوجھ اُٹھائے پھر رہا ہوں۔ اگر کسی کو میری کسی بات پر اعتراض ہے تو وہ یاد رکھے کہ مَیں نے اِس ڈائٹ کے تمام ممبروں سے زیادہ ووٹ حاصل کئے ہیں اور عوام کی جو تائید و حمایت مجھے حاصل ہے وہ کسی اَور کو حاصل نہیں۔ خبردار جو کسی نے میرے مُنہ آنے کی کوشش کی !!

اِس دانتا کلکل کا یہ فائدہ ہُوا کہ موصوف کو ٹی وی پر اتنے پروگرام ملے اور عوام نے اتنے جوش و خروش سے یہ پروگرام دیکھے کہ اگر آج دوبارہ الیکشن ہو تو وہ اپنا قائم کیا ہُوا ریکارڈ دوبارہ قائم کر سکتے ہیں۔ جاپانیوں کو بھی ہماری طرح ایکٹنگ کرنے والے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں اور الیکشن جیتنے کے لئے یہ نسخہ یہاں بھی تیر بہدف سمجھا جاتا ہے۔ (نئے الیکشن میں وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے ہیں)۔

ہم نے قبلہ کے وہ پروگرام خاص طور سے دیکھے شکل و صورت میں وہ بالکل ہمارے پنجابی ٹاکرے والے سے ملتے جُلتے تھے اور باتیں بھی اسی طرح بودی اور بے تُکی کرتے تھے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ تنقید کرتے تو برملا کرتے تھے، ہمارے شیر کی طرح حکومت کے تلوے نہیں چاٹتے تھے! ایک پروگرام میں تشریف لائے تو بالکل گنجِ گراں مایہ بن کے آئے۔ اگلے میں آئے تو یہ لمبے لمبے نفیس بال اُگے ہوئے تھے۔ پروگرام کے آخر میں فرمایا یہ وِگ مجھے فلاں وِگ بنانے والوں نے تحفے میں



دی ہے آپ بھی خرید یئے۔ گویا حضرت کا پُورے کا پُورا پروگرام وِگ بنانے والوں کی طرف سے تھا۔

تیسرے پروگرام میں تشریف لائے تو داڑھی لگا کے تشریف لائے۔ وہ صرف یہ بتانا چاہتے تھے کہ آئین کی رُو سے اُن کو حق حاصل ہے کہ وہ جو بہروپ بھرنا چاہیں بھر لیں —— بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش!

اور چوتھے میں تو آپ نے حد کر دی۔ دو نوجوان لڑکیوں کو بغل میں دبائے تشریف لائے۔ کبھی اس کی طرف دیکھتے، کبھی اس کی طرف اور پھر دونوں میں مقابلہ کروا دیا کہ اپنے اپنے حُسن کی خوبیاں گنواؤ۔ جو جیت گئی اسے اپنی جیبِ خاص سے انعام عطا فرمایا۔ انعام دیتے ہوئے کچھ ارشاد بھی فرمایا جو ہمیں سمجھ نہیں آیا۔ ہمارے ترجمان نے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر فرمایا "کچھ نہیں بس یونہی سی بات کہی ہے۔"

اِن چاروں پروگراموں کو دیکھنے کے بعد ہم مدّتوں اہلِ جاپان کے ذوق پر غور کرتے رہے جو مسخروں کو قانون ساز اداروں میں پہنچا دیتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمارے آئین سازیوں دن دہاڑے حُسن کے مقابلے نہیں کرواتے پھرتے!

---

ہمارے دوستوں میں محمد ادریس، اپنی خوبصورتی، دلآویزی اور انگریزی میں

بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے (یہ پاکستان ٹائمز اور شادی سے پہلے کی بات ہے)، یونیورسٹی کی طرف سے ہم لوگ مباحثہ میں حصہ لینے کے لئے حیدرآباد گئے۔ محمد ادریس نے کمرہ اندر سے بند کر کے دو گھنٹے تک اپنی خوبصورت انگریزی تقریر کا ڈریس ری ہرسل کیا اور جب تقریر کی تو بروہی صاحب جیسے قانون دان کے چھکّے چھڑا دیئے۔ ہم اس ڈریس ری ہرسل پر مدّتوں ادریس کا مذاق اُڑاتے رہے۔ مگر ابھی جنوری کے شروع میں امریکہ کے نو منتخب صدر جیمی کارٹر صاحب نے حلف اُٹھانے سے بیشتر، جاپان کے وزیر اعظم کو ٹیلیفون کیا، تو وزیر اعظم موصوف کی ایک تصویر اخبارات میں شائع ہوئی۔ نیچے لکھا تھا، وزیر اعظم صاحب کارٹر صاحب سے ٹیلیفون پر گفتگو کرنے سے پیشتر ڈریس ری ہرسل کر رہے ہیں۔ ہم نے ذرا حیرت سے آنکھیں مل کر دوبارہ کیپشن پڑھی، وہ تصویر واقعی ری ہرسل کی تصویر تھی، ان کے چہرے پر وہ تمام ہوائیاں موجود تھیں جو ہم نے محمد ادریس کے خوب صورت چہرے پر دیکھی تھیں۔ محمد ادریس کو تو صرف بروہی صاحب کے سامنے تقریر کرنا تھی اور وزیر اعظم موصوف تو کارٹر صاحب سے گفتگو کرنے والے تھے۔ مگر اس تمام ری ہرسل کے باوجود کارٹر صاحب کی طرف سے ٹیلیفون آیا تو وزیر اعظم صرف تین فقروں کے بعد رہ گئے اور فرمایا "میں انگریزی میں اچھی طرح گفتگو نہیں کر سکتا اس لئے اب ترجمان کی وساطت سے بات چیت کرونگا۔" ہم نے فوراً پُرانی تصویریں کھنگالیں اور محمد ادریس کی تصویر دیکھ کر دیر تک



سوچتے رہے کہ اگر محمد ادریس ہیں اور کارٹر صاحب ہیں گفتگو ہوتی تو کارٹر صاحب تین فقروں کے بعد کہہ اُٹھتے قبلہ ذرا ٹھہریئے ہم ترجمان کی وساطت گفت گو کریں گے!

بات یہ ہے کہ اس قوم کو انگریزی بالکل نہیں آتی اور ہم جو پاکستانی انگریزوں کے سامنے بھیگی بلّی بنے رہتے تھے یہاں سر اُٹھا کر چلتے ہیں اور راجہ مہدی علی خان مرحوم کو یاد کرتے ہیں ؎

وہ کہتے ہیں انگلش میں محبت کی کرو بات!
آتی نہیں اُردو کے سوا مجھ کو زباں اَور

اس ملک میں انگریزی کو انگریزی بھی نہیں کہتے۔ امریکہ کی زبان کہتے ہیں۔ یہاں بھی عام لسانی دستور کے مطابق تمام زبانیں ملکوں کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ پاکستان کی زبان، بھارت کی زبان، عرب کی زبان، فرانس کی زبان؛ حتیٰ کہ اپنی زبان کو بھی جاپان کی زبان کہتے ہیں۔ ہم انگریزی کو انگریزوں کی زبان کہتے ہیں، انہوں نے انہیں اس زبان سے بیک زبان بے دخل کر کے اسے امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا ہے اسی لئے محترمہ اختر ریاض الدین کو جاپان والوں میں کوئی نستعلیق نک سُک سے درست برطانوی انگریزی بولنے والا نہیں ملا۔

کامل اس فرقۂ زُہّاد سے اُٹھا نہ کوئی!

صنعتی لحاظ سے اس مُلک نے اپنی مصنوعات کی بدولت یورپ کی الیکٹرانک

مارکیٹ پر قبضہ کر رکھا ہے مگر صنعت کاروں کو انگریزی کا ایک لفظ نہیں آتا۔ پچھلے سال اوساکا چیمبر آف کامرس والوں نے کراچی کے پروفیسر اسلم شاہ کے ہمراہ ہمیں بھی کچھ صنعتی ادارے دیکھنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ہم ماتسوشیتا الیکٹرک کمپنی کے ٹی وی بنانے کے کارخانے میں گئے۔ یہ ماتسوشیتا والے نیشنل اور پین سونک برانڈ کی مصنوعات بناتے ہیں۔ دُنیا کے اٹھائیس ممالک میں ان کی ذیلی کمپنیاں ہیں۔ ان کا ادا شدہ سرمایہ تین ارب ڈالر ہے۔ شعبہ کے سربراہ نے لپک کر ہمارے قدم لئے، احترام سے ایک کمرہ میں بٹھایا اور جاپانی میں فرفر تقریر فرمانے لگے۔ ترجمان اُن کی تقریر کا امریکی انگریزی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ قبلہ نے آغاز ہی یہاں سے کیا "معاف کیجئے ہمیں انگریزی نہیں آتی"۔ ہم نے کہا "بہت اچھی بات ہے اگر آپ بھی ہماری طرح انگریزی سیکھ لیتے تو وہیں ہوتے جہاں ہم ہیں"۔ اس مُلک میں ترجمانوں کی چاندی ہے۔ گراں قدر مشاہروں پر ملازم رکھے جاتے ہیں۔ لوگ بہت کوشش کر کے غیر ملکی زبانیں سیکھتے ہیں۔ چار یونیورسٹیاں غیر ملکی زبانیں سکھانے کے لئے قائم ہیں اور ہم بھی اس قوم کی اسی علّت کے طفیل یہاں جاپان میں بیٹھے ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اس قوم کو غیر مُلکی زبان سکھانا جُوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جنرل میکارتھر تک نے ہتھیار ڈال دیئے اور امریکی کلچر کی ہائی پوٹنسی خوراک دینے کے باوجود امریکی زبان انہیں نہیں سکھا سکا تو ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہُنر میں یکتا ہیں؟



بیگم اختر ریاض الدین نے کسی امریکی یانکی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جاپانی قوم انفرادی طور پر بہت غبی قوم ہے۔ شروع شروع میں ہمارا بھی یہی خیال تھا مگر تجربہ نے بتایا کہ جاپانی غبی ہرگز نہیں ہیں صرف غیر ملکی زبان بولنے والے کی بات پُوری طرح نہیں سمجھ پاتے کیونکہ وہ زبان اُنہیں نہیں آتی۔ جاپانی میں بات کر کے دیکھئے اور پھر دیکھئے اندازِ گُل افشانیٔ گفتار۔ یہ لوگ ہر بات کو اس کے تمام آگے پیچھے کے ساتھ سُننے اور سمجھنے کے عادی ہیں لہذا انگریزی ہو یا اُردو، اگر آپ کا مخاطب اس زبان پر حاوی نہیں تو اُس کے پلّے کچھ نہیں پڑے گا۔ جو لوگ زبان سمجھتے ہیں اُن سے بات کر کے دیکھئے۔ اگر اُردو کی آزمائش درکار ہو تو ہمارے دوست پروفیسر کاگایا، پروفیسر ہاما گوچی، پروفیسر اساده اور پروفیسر سوزوکی سے کر کے دیکھئے۔ سوزوکی صاحب تو شعر پڑھنے سے بھی نہیں چُوکتے۔ جاپان آنے سے پہلے ہم ویزا لینے کے لئے جاپانی سفارت خانہ میں گئے تو ناکانو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ناکانو صاحب ہماری یونیورسٹی کے گریجوایٹ ہیں۔ اس شُستہ، رفتہ اور سلیس زبان میں گفتگو فرمانے لگے کہ ہمارے اُردو کے ایم اے بھی نہیں کر سکتے۔ جس قوم کے لوگ اتنی خوبصورتی سے غیر ملکی زبان سیکھ لیتے ہیں وہ کیسے غبی ہو سکتی ہے؟ —— اگر امریکی انگریزی اُن کے پلّے نہیں پڑتی تو قصور جاپانیوں کا نہیں ہے —— اس قوم نے غلامی کے طفیل انگریزی نہیں سیکھی، جو کچھ جتنی کچھ سیکھی ہے اپنی کوشش اور محنت سے سیکھی ہے۔ یہی حال دوسرے علوم کا ہے محض ایمان بالغیب کو یہ لوگ

بُرا سمجھتے ہیں۔ ڈھنگ سے دلیل سے بات کیجیے تو اُن کے دماغ میں بیٹھے گی ورنہ اِس کان سے سُن کر اُس کان سے نکال دیں گے! ٹیکنالوجی ان لوگوں نے دوسروں سے سیکھی مگر اب یہ عالم ہے کہ الیکٹرانک ٹیکنالوجی میں دنیا ان کے سامنے پانی بھرتی ہے!

جاپانی لوگ استعاروں کے تو بالکل قائل نہیں اور ہمیں تو یہاں آکر معلوم ہُوا کہ سجّاد باقر رضوی نے یہ شعر قیصر کے لئے نہیں کسی جاپانی محبوبہ کے لئے کہا تھا کہ

لفظوں میں میری آنکھ بھی دِل بھی شریک ہے
تو میری جان صرف لغت سے نہ کام لے

یہ لوگ صرف لغت سے کام لیتے ہیں اور فیروز اللغات کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔

ہمارا خیال تھا کہ اِس قوم میں حسِّ مزاح بالکل نہیں ہے۔ ہے۔ ہم نے لوگوں کو نہ صرف مُسکراتے بلکہ بعض اوقات قہقہے لگاتے بھی دیکھا ہے۔ خدا معلوم کِس بات پر ہنستے ہیں؟



## ۱۰

۱۹۱۸ء کی بات ہے کہ ایک کمپنی کے ایک منحنی اور کمزور سے ضعیف البنیان قِسم کے ملازم نے کمپنی والوں کو بجلی کا ایک سوِچ پیش کیا کہ ــــ "ملاحظہ فرمایئے خاکسار نے ایجاد کیا ہے"۔

کمپنی والوں نے اسی بے تکلّفی سے اُسے بیک بینی و دو گوش نکال باہر کیا کہ آپ کو کمپنی نے ایجادات کرنے کے لئے ملازم نہیں رکھا ہے۔ آپ اپنی ملازمت کا وقت دوسرے فضول کاموں پر صرف کر کے مجرمانہ غفلت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ چلتے پھرتے نظر آیئے اور اپنی ایجاد کو بیٹھ کر چاٹیئے!

صاحب مُنہ لٹکائے گھر آ گئے۔ بیگم سے مشورہ کیا۔ جمع پونجی کا حساب لگایا۔ مبلغ ایک سوَین کی کُل کائنات نکلی۔ ایک سوَین جو پاکستان کے حساب سے تین روپے تیس پیسے بنتے ہیں۔ اِس خطیر سرمائے سے اپنے نامِ نامی پر "ماتسوشیتا

الیکٹرک کمپنی" کی بنیاد رکھی اور بجلی کے سوِچ بنانے لگے۔ برانڈ کا نام "نیشنل" رکھا اور اس روز ہم نے ماتسوشیتا کا اِبارا کی پلانٹ دیکھا تو ہمیں بتایا گیا کہ ۱۹۷۵ء میں اس کمپنی کا ادا شدہ سرمایہ صرف تین ارب ڈالر تھا یعنی تقریباً تیس ارب روپے۔ یعنی وہ تین روپے اب تیس ارب روپے بن چکے ہیں۔ ہم نے پوچھا ——— اور وہ کمپنی جس نے انہیں چھٹی کرا دی تھی کتنے ارب روپے کی مالک ہے؟ جواب ملا صرف تیس برس پہلے غفرلہٗ ہو گئی کیونکہ دیوالہ پٹ گیا تھا ——— صاحبو! یہ جو گھروں میں نیشنل ٹی وی، اور ریڈیو اور ٹرانزسٹر اور ریفریجریٹر اور پتہ نہیں کیا کیا لئے پھرتے ہو یہ اسی ماتسوشیتا الیکٹرک کمپنی کے بنائے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں ان کے برانڈ کا نام PANSONIC اور TECHNICS ہے۔ ہمارے ہاں اور باقی دُنیا میں "NATIONAL" برانڈ کا پردہ اُٹھائیے تو نیچے ماتسوشیتا صاحب بیٹھے سستاتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ صحت کسی زمانہ میں بھی قابلِ رشک نہ تھی اور اب تو بڑھاپا بھی ہے۔ نرینہ اولاد سے محروم ہیں اس لئے داماد کو انتظامی امور سونپ رکھے ہیں اور داماد صاحب نے بھی جاپان کی رسم کے مطابق ان کا خاندانی نام اپنا رکھا ہے۔ قبلہ کا نام "کونوسوکے ماتسوشیتا" (KONO SOKE MATSUSHITA) ہے اور غیر قبلہ کا اسمِ گرامی "ماساہارو ماتسوشیتا"۔ (MASAHARU MATSUSHITA) کمپنی نے دنیا کے صرف



اکیس ممالک میں ذیلی مینوفیکچرنگ کمپنیاں بنا رکھی ہیں اور پندرہ ممالک میں ضمنی سیلز کمپنیاں قائم کر رکھی ہیں۔ یعنی ہر حال میں الیکٹرانک مارکیٹ پر قبضہ جما رکھا ہے اور اس الیکٹرانک دَور میں انسانی عزم، ولولہ اور بلند ہمّتی کا عَلَم اُٹھایا ہُوا ہے۔ ہمیں الیکٹرانکس سے تو چنداں دلچسپی نہیں مگر انسان کی اولوالعزمی سے شغف ہے لہٰذا اس "ماتسوشیتی" کے مرتکب ہو رہے ہیں یعنی طبعیات کے شعبہ میں "دخل در معقولات" کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ ہم الیکٹرانکس کی الف بے بھی نہیں جانتے۔

اُس روز ہم نے اِس کمپنی کا ٹیلیویژن پلانٹ بچشمِ خود دیکھا اور ابھی تک بہ خوابِ خود دیکھ رہے ہیں۔

اِبَارَاکی کے مقام پر اِس کمپنی کا جو پلانٹ ہے وہ صرف ٹیلی ویژن بناتا ہے اور صرف جاپان میں اِس کمپنی کے ساٹھ پلانٹ، تیرہ ریسرچ لیبارٹریاں اور ساٹھ ریسرچ گروپ ہیں۔ اور کمپنی کے پاس صرف انتیس ہزار (۲۹,۰۰۰) چیزوں کے پیٹنٹ حقوق ہیں۔ یعنی یہ ۲۹۰۰۰ چیزیں صرف یہ کمپنی بنا سکتی ہے کوئی اَور نہیں بنا سکتا۔ حد ہو گئی۔ ذرا سوچئے کہ ایک سوِچ کے پیٹنٹ رائٹ سے انتیس ہزار تک اِس کمپنی نے کتنا فاصلہ طے کیا۔ ع

"ہر مردے و ہر کارے"

ہم ریسرچ کے شعبہ میں داخل ہوئے تو سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ایک

ٹیلی ویژن سیٹ ایک سٹول پر رکھا تھا اور اُس کے اندر سے دو لاکھ وولٹ بجلی گزاری جا رہی تھی۔ ہم نے پوچھا "اِس بے چارے سے کیا قصور سرزد ہوا ہے کہ اسے اِس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے؟" فرمانے لگے "یہ ایک نہیں ہر سیٹ اِس عذاب سے گزرتا ہے۔ دیکھنا یہ مقصود ہے کہ اگر آسمانی بجلی سیٹ میں سرایت کر جائے تو اسے نقصان تو نہیں پہنچتا؟ اور جواب یہ ہے کہ نہیں پہنچتا کیونکہ اس امتحان کے بعد سیٹ ٹھیک ٹھاک کام کر رہا ہے۔"

دوسرے کمرہ میں ایک سیٹ رکھا تھا۔ کمرہ کی فضا میں اتنی ٹھنڈک پیدا کی گئی تھی جتنی ہمالیہ کی چوٹی پر ہو سکتی ہے یہ سیٹ اس ٹھنڈک سے گزر کر بھی ٹھیک ٹھاک تھا اور شرپا تن سنگھ کی طرح تنتنا رہا تھا۔ تیسرے کمرہ میں گرمی اور حبس کی آزمائش تھی یعنی اتنی گرمی جتنی ممکن ہو سکتی ہے (ہمارے ملتان جتنی تو ضرور ہو گی) چوتھے میں بھی کچھ تھا جس کے بارہ میں ٹھیک طرح سمجھ نہیں آیا۔ کوئی حسابی معاملہ تھا اور حساب سے ہمارے تعلقات شروع سے ہی کشیدہ رہے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے ہمارے استاد پروفیسر محمد ابراہیم ناصر مرحوم سکول میں فرمایا کرتے تھے:

"تمہیں ساری عمر حساب نہیں آ سکتا"

اور الحمد للہ کہ ہم نے اپنے استاد کی اس بات پر آج تک حرف نہیں آنے دیا اللہ ہمیں استقامت بخشے!



پھر آٹومیٹک پلانٹ کی باری آئی۔ کمپیوٹر کام کر رہے تھے۔ وسیع و عریض ہال میں بے شمار سیٹ بیک وقت تیار ہو رہے تھے اور کوئی متنفس وہاں موجود نہیں تھا۔ کھٹا کھٹ مشینیں چل رہی تھیں۔ ہر دس کمپیوٹروں کے بعد ایک ماسٹر کمپیوٹر تھا اور یوں سر اُٹھائے کھڑا تھا جیسے استاد ڈنڈا پکڑے کلاس میں کھڑا ہو۔ یعنی ہر سیٹ اس کمپیوٹر کے پاس آتا اور وہ جانچتا کہ اس میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ اگر غلطی نکلتی تو وہ سیٹ فوراً متعلقہ کمپیوٹر کو واپس بھیج دیتا مگر ایسا بہت شاذ ہوتا ہے بلکہ نہیں ہوتا۔ ہم کچھ دیر کھڑے ہو کر یہ تماشہ دیکھتے رہے اور انسانی ذہن کی داد دیتے رہے انسان نے مشین کو کس طرح اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اس روز آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مفتی صدر الدین آزردہ کا شہر آشوب یاد آیا ؎

گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سُنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

اس کے بعد اس ہال میں گئے جہاں انسان کام کر رہے تھے بے شمار لوگ انہماک سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ہم لوگ معائنہ کرتے پھرے کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ کون آیا ہے یا کون گیا۔ ایک چھوٹے سے کمرہ میں کچھ خواتین و حضرات جھگڑ رہے تھے، گرما گرم بحث ہو رہی تھی، ہم لوگ دبک کر کھڑے ہو گئے اور انتظار کرنے لگے کہ ابھی اس بک بک جھک جھک کے بعد چیٹم چٹیا ہو گی اور گھمسان کا رن

پڑے گا مگر کچھ بھی نہیں ہوا سب لوگ ایک ٹی وی سیٹ کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک صاحب نے کچھ کہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس ٹی وی پر ایک بزرگ سے نمودار ہوئے کچھ فرمایا کچھ نقشے بنائے اور بات ختم ہو گئی۔

ہم نے پوچھا کہ "یہ کیا معاملہ تھا؟" بتایا گیا کہ یہ ریسرچ سٹڈی گروپ ہے جو کسی ایک خاص پرزے پر تحقیق کر رہا ہے۔ انہیں کوئی مسئلہ درپیش تھا وہ حل نہیں ہوا تو ریسرچ کے ہیڈ آفس کو مطلع کیا۔ ٹیلی ویژن پر جو صاحب آئے وہ بڑے ریسرچ افسر تھے انہوں نے مسئلہ حل کر دیا ہے اور اب یہ لوگ پھر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔

آخری شعبہ وہ تھا جہاں ٹی وی کی ترسیل کا کام ہوتا ہے۔ وہاں گئے، پوچھنے سے تو تنگ آ گئے تھے اور شاید بتانے والے بھی تنگ آ گئے ہوں گے۔ ہم نے ایک چارٹ ملاحظہ کیا۔ ٹی وی بنانے کی تفصیلات درج تھیں جو ہم نے جلدی میں نقل کر لیں اور آپ بھی جلدی جلدی پڑھ لیں —— اوں ہوں! ایسے نہیں ذرا سُن وار دیکھیں:

۱۹۲۵ء میں ٹی وی پر ریسرچ کا آغاز ہوا۔ یعنی راقم الحروف کی پیدائش سے بھی ایک برس پہلے۔ اپنی تاریخِ پیدائش کے حساب سے اپنا حساب آپ خود کر لیں —— ۱۹۳۸ء میں پروٹو ٹائپ ٹیلیویژن بنایا گیا جس کی ٹیوب بارہ انچ کی تھی اور جس کا DEFLECTION ANGLE ۵۰° درجے تھا۔



۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۱ء تک ریسرچ ہوتی رہی اور ۱۹۵۱ء میں پہلا باقاعدہ سیٹ بنایا گیا اور جاپان کے سرکاری ریڈیو NHK نے اسے قبول کر لیا۔ ۱۹۵۲ء میں پہلا ٹی وی سیٹ مارکیٹ میں فروخت کے لئے پیش کیا گیا۔ اور ۱۹۶۸ء تک ایک کروڑ سیٹ تیار کئے گئے۔ یعنی کمپنی پندرہ سال اور چار مہینے میں ایک سے ایک کروڑ تک پہنچی۔ ۱۹۷۴ء تک چار کروڑ سیٹ بن چکے تھے اور ۱۹۷۵ء کے بارہ میں بھی کچھ لکھا تھا وہ پڑھا نہیں گیا۔ ہندسے اتنے زیادہ تھے کہ ہمارا حساب اُن کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اور پھر بات یہ ہے کہ اتنے اعداد لکھنے کے بعد ہمارا معدہ بھی کچھ گڑبڑ کرنے لگتا ہے اور "ہاضمون" مانگتا ہے جو اتنی دُور سے ہم کیسے منگوائیں گے؟ ہمارے دوست ناجی سبزواری ہاضمون کی تعریف میں فرما گئے ہیں —— اللہ اللہ ؎

اِس قدر تاثیر دیکھی نہ سُنی
گل گئے جبڑے مرے آنتوں سمیت
اور جب معدے میں اُتری "ہاضمون"
ہضم کھانا ہو گیا آنتوں سمیت

دیکھی آپ نے "ہاضمون" کی تاثیر؟ ہم الیکٹرانکس کی باتیں کرتے کرتے کہاں پہنچ گئے ہیں!

گھر پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ گھر خط لکھا کہ وہ نیشنل برانڈ ٹی وی

جو ہم وہاں رکھ کر آئے ہیں اس کو دھڑلے سے استعمال کریں اور ان لوگوں
سے ہرگز مرعوب نہ ہوں جو اس برانڈ کے علاوہ دوسرے ٹیلیویژن سیٹ
رکھتے ہیں۔ ایک خط قبلہ قریشی محمود الحسن صاحب مدظلہ، کو معذرت کا
لکھا۔ کیونکہ جب انہیں نیشنل ٹی وی کی ایجنسی ملی تھی ہم نے بہت باتیں
بنائی تھیں۔ خدا معلوم یہ باتیں "ہاضمون" کے زیرِ اثر نکل رہی ہیں یا "ماتسوشیتا"
کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ جب سے ہم وہاں سے آئے ہیں یہ
اُمنگ دل میں پل رہی ہے کہ ماتسوشیتا صاحب سے ملا جائے۔ دیکھیں تو سہی
وہ کیسے لوگ ہیں جو ایسے کام کر گزرتے ہیں۔ تصویر سے تو وہ صرف ماتسوشیتا
لگتے ہیں اور کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔



## رپورتاژ

## (۱۱)

۶ اگست ۱۹۷۷ء کو ہماری گاڑی ہکاری ۵ تقریباً اسی وقت اور اسی رفتار
سے ہیروشیما پہنچی جس وقت اور جس رفتار سے عین ۳۲ برس قبل ۲۹-B سپر فورٹریس
"اینولاگے" (ANOLA-GAY) اپنے تباہ کن اور مہلک بوجھ سمیت ہیروشیما کی فضا میں
داخل ہوا تھا۔ مگر اللہ اللہ! انسان اور انسان میں کتنا فرق ہے؟ کرنل تبت اور
کیپٹن ولیم پارسن موت اور تباہی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ مگر ہم ان مظلومین
کی روحوں کی آسودگی کی دعائیں لے کر سرزمینِ ہیروشیما پر قدم رکھنے والے
تھے۔

۱۶ اگست کا دن اہلِ جاپان کے لئے خصوصاً اور اہلِ عالم کے لئے
عموماً عبرت، درد انگیزی اور توبہ کا دن ہے۔ کیونکہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو

اتّحادیوں نے جاپان کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کے لئے دنیا کا مہلک ترین ہتھیار "ایٹم بم" ہیروشیما پر گرایا تھا اور دیکھتے دیکھتے ایک ہنستے بستے معصوم شہر کو جہنّم میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس لئے اہلِ جاپان ۶ر اگست کو اُن معصوم رُوحوں کی آشتی اور مُکتی کے لئے دعائیں مانگتے ہیں اور جوق در جوق اس اجتماعی یادگار پر حاضر ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی عین اُس دن ہیروشیما پہنچنے اور اس عبرت کدہ کو دیکھنے کا پروگرام بنایا اور آٹھ دن پہلے سے گاڑی میں سیٹ ریزرو کروالی۔ اگر ہم ایک گھنٹہ دیر سے پہنچتے تو ۶ر اگست کو ہیروشیما نہ جا سکتے۔

ہیروشیما کے رہنے والوں پر ۶ر اگست ۱۹۴۵ء کا سورج حسبِ معمول ۵ بج کر ۲۷ منٹ پر طلوع ہُوا۔ لوگ باگ، بچّے بالے اپنے اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ اِرد گرد کے شہروں سے سکولوں کے بچّے ہزاروں کی تعداد میں ہیروشیما پہنچے اور قومی خدمت کے جذبے کے ساتھ اُن مخدوش عمارتوں کو منہدم کرنے میں جُٹ گئے جو ہفتہ بھر پہلے کی بمباری سے متأثر ہوئی تھیں اور جن کا وجود اہلِ شہر کے لئے ضرر رساں ہو سکتا تھا۔ کنڈر گارٹن سکولوں کے پھُول ایسے معصوم بچّے اور بچّیاں حسبِ معمول اپنی وردیوں میں ملبوس، ہاتھوں میں بستے پکڑے اُچھلتے کُودتے، چہلیں کرتے، سکولوں کی جانب رواں دواں تھے کیونکہ انہیں



سوا آٹھ بجے سکول پہنچنا تھا۔ بازاروں میں چہل پہل اور رونق شروع ہو گئی تھی۔ اگست میں سکولوں میں چھُٹیاں ہوتی ہیں مگر ان معصوم بچّوں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر قوم محاذِ جنگ پر مصروف ہے تو وہ اپنے محاذِ تعلیم پر مصروف رہیں گے۔

اِرد گرد کے پہاڑوں پر سبزہ کی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ روِشوں پر اگست کے نارنجی، سفید اور نیلے پھُول کھِلے ہوئے تھے۔ گھروں کے سامنے رکھے ہوئے گملے، ننھّے ننھّے پھُولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کسی کو وہم بھی نہ تھا کہ کچھ دیر بعد کیا ہونے والا ہے کہ اچانک شمال مشرق کے رُخ سے ایک طیّارہ نمودار ہُوا جسے سب نے دیکھا مگر کوئی یہ بتانے کے لئے باقی نہ رہا کہ اس کے بعد کیا ہُوا ــــــ ؟

ع
پھر نہ کچھ آیا نظر جز شعلۂ پُر پیچ و تاب

سوا آٹھ بجے ایتولا۔ گے، کے کیپٹن کرنل تبّت نے امریکی فوج کے ماہرِ اسلحہ کیپٹن پارسن کو عین میونسپل ہال کے اُوپر پہنچ کر بم گرا دینے کا حکم دیا۔ شدید جھٹکے، دھماکے اور چندھیا دینے والی روشنی کے ساتھ وہ بوجھ طیّارہ سے جُدا ہو گیا اور طیّارہ پُوری رفتار سے آگے شمال مغرب کی طرف مُڑ گیا۔ نیچے سوائے دُھوئیں اور آگ کے اور کچھ نہ تھا۔ دس منٹ کے بعد جاسوسی طیّارے بھیجے گئے کہ وہ اس کارنامے کے نتائج کی تصویر

لے سکیں سوائے ایک ایٹمی بادل کے اور وہاں کچھ نہ تھا، فضا دھندلی تھی
—— ایک گھنٹہ بعد جو تصویر لی گئی اس سے ظاہر ہوا کہ سوا تین لاکھ انسانوں
کا یہ شہر، راکھ اور ملبہ کا ڈھیر بن چکا ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۝

دو گھنٹے بعد گیارہ بجے، وائٹ ہاؤس کی ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں
صدر ٹرومین نے اعلان کیا کہ:

"میں اپنی قوم کو یہ خوش خبری دینا چاہتا ہوں کہ امریکی اور
انگریز سائنس دانوں نے مشترکہ کوششوں سے کائنات کی
بے پناہ قوت کو زیرِ نگیں کر لیا ہے اور اب سے کوئی دو گھنٹے
پیشتر جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا جا چکا ہے۔"

اتحادیوں نے بغلیں بجائیں۔ سائنس دانوں کے فوٹو اور پروفائل اخباروں
میں شائع کئے گئے۔ کرنل تبت نے مسکراتے ہوئے بیان جاری کیا کہ:

"ایٹم بم ایک دھماکے کے ساتھ طیارہ سے جدا ہوا
اور ہیروشیما کا شہر اُبلتے ہوئے دھوئیں اور لپکتے ہوئے
شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔"

۸ راگست کے لندن کے اخبار نیوز کرانیکل نے پہلے صفحہ پر سرخ اور جلی
حروف میں ہیروشیما کا نام لکھا اور ساتھ ہی یہ انتباہ بھی شائع کیا کہ:

"اتحادی جاپانیوں کو ہیروشیما کی تباہی سے عبرت



حاصل کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔ اگر وہ ہتھیار نہیں
ڈالیں گے تو جاپان کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا جائیگا۔"
عبرت کے لئے یہ تفصیلات بھی شائع کی گئیں کہ:

"اس ایک ایٹم بم سے وہ تباہی ہوئی ہے کہ اگر موجودہ
دور کے طاقتور ترین بموں کو لے کر اتحادی طیارے ایک
ہزار حملے بھی کریں تو وہ نتائج حاصل نہ کر سکیں۔"

وہ نتائج یعنی بارہ مربع میل کے شہر کی مکمل تباہی اور تین لاکھ اٹھارہ ہزار
نفوس کی ہلاکت۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

جب جاپانیوں نے خاطر خواہ عبرت حاصل نہ کی تو دوسرا بم ناگاساکی
پر گرایا گیا۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اتحادیوں کے گھروں میں گھی
کے چراغ جلے مگر ان معصوم روحوں کی یادگاروں پر ایک چراغ جلانے
والا بھی کوئی باقی نہ رہا۔

یہ بم عین میونسپل ہال کے اوپر فضا میں تقریباً دو ہزار فٹ کی بلندی
پر پھٹا اور سارے شہر کو چشم زدن میں جلا کر رکھ دیا۔ وہ روشنی اور شدت
پیدا ہوئی کہ سومی تومو بنک کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا ایک انسان ہوا میں
تحلیل ہو گیا مگر اس کا سایہ پتھر پر ثبت ہو گیا۔ کچھ دور پرے ایک پل
پر ایک گھوڑا گاڑی کا عکس پل پر رہ گیا گاڑی اور گاڑی والے تحلیل

ہو گئے۔ پتھر کے ایک کھمبے پر چھتنار کے پتّوں کا عکس رہ گیا، چھتنار غائب ہو گیا۔ لوہا پگھل کر موم کی طرح بہنے لگا۔ جو انسان زمین کے نیچے تھے یا اس مہلک روشنی کی براہِ راست زد سے محفوظ تھے اُن کی جلد جسم سے جُدا ہو کر چیتھڑوں کی طرح لٹکنے لگی۔ آنکھیں، ناک اور مُنہ برابر ہو گئے۔ اور جو دھماکے کے مرکز سے ذرا دُور تھے اُن کے جسموں کے کپڑے جل گئے مگر کپڑوں کی دھاریاں جسموں پر ثبت ہو گئیں۔ سکّے پگھل گئے۔ برتن چُڑ مُڑ ہو گئے حتّٰی کہ بُتوں کی شکل بھی بگڑ گئی —— کوئی بھی محفوظ نہ رہا —— جاندار نہ بے جان —— عابد نہ معبود ——،

ہم عین سوا آٹھ بجے، ہیروشیما کے امن پارک میں پہنچے۔ لاکھوں لوگ وزیرِ اعظم میکی تاکیو کی قیادت میں سر جھکائے اجتماعی یادگار کے سامنے کھڑے تھے۔ ہم نے بھی اسلامی طریق پر دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے کہ:

"اے خدا! اِن رُوحوں کو آسودگی دے کہ یہ انسان انسانوں کی بربریّت کا شکار ہیں۔"

جب بھیڑ ذرا چھٹ گئی تو اس یادگار کے قریب گئے۔ لوگوں نے پھولوں کی چادروں سے اسے ڈھانپ دیا تھا۔ مگر لوح کے الفاظ صاف نظر آ رہے تھے:

"اے معصوم رُوحو!



ابدی آرام اور سکون، تمہارے نصیب ہو!
ہم عہد کرتے ہیں کہ دوبارہ ایسا نہیں ہو گا۔"

ہم نے یہ لوح پڑھی تو دل سے دُعا نکلی "اے کاش! اے کاش!..."

سامنے امن کی آگ روشن تھی، پیچھے امن کا عجائب گھر تھا اور ذرا سامنے میونسپل ہال کی چار منزلہ عمارت کا کھنڈر تھا جس کے گنبد کی چوکھٹ اس لئے سلامت رہ گئی کہ بم عین اس کے اُوپر فضا میں پھٹا تھا اور ایٹمی ہَوا کے ظالم تھپیڑے اِرد گرد پھیل گئے تھے۔ اس گنبد کو امن کا گنبد کہتے ہیں۔

اہلِ ہیروشیما نے اس تباہ شدہ شہر کے ملبہ پر ایک نیا ہیروشیما تعمیر کر لیا ہے۔ بلند و بالا صاف سُتھری عمارتیں، بازار، سڑکیں، مکان، سب کچھ، مگر اس خاص حصّہ کو جہاں بم پھٹا تھا امن پارک میں تبدیل کر دیا ہے اور ایک امن کا عجائب گھر بھی بنایا ہے جہاں اس ہلاکت آفرینی کی یادگاریں محفوظ رکھی گئی ہیں کہ اہلِ بصیرت انہیں دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔

ہم امن کے عجائب گھر میں داخل ہونے لگے تو روک دیئے گئے کہ اِس وقت وزیرِ اعظم صاحب معائنہ فرما رہے ہیں —— ذرا توقف کیجئے!

تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ میکی صاحب آنسو پونچھتے سیڑھیوں سے اُتر

رہے ہیں اور جلو میں فوٹو گرافروں، اخباری نمائندوں اور ہیروشیما کے بڑوں کا ایک لشکرِ جرار ہے۔ کہنے نے کہا یہ وزیرِ اعظم کے آنسو معلوم ہوتے ہیں جو عوام کے سامنے نکل ہی آیا کرتے ہیں۔ مگر جب ہم عجائب گھر سے باہر نکلے تو ہمارے آنسو بھی نکلے آتے تھے اور ہم یقیناً وزیرِ اعظم نہیں ہیں۔

عجائب گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے تباہی سے پہلے کے ہیروشیما کی تفصیلات نظر آئیں۔ تین لاکھ اٹھارہ ہزار کی آبادی تھی۔ سولہ سکول تھے، دس ہسپتال تھے اور تین طرف سے خوبصورت پہاڑوں میں گھرا ہوا یہ شہر ایک طرف سے سمندر کے ساتھ ہمکنار تھا اور جاپان کی اہم دفاعی بندرگاہ تھا اور اسلحہ کا مشہور مرکز تھا۔ ذرا آگے گئے تو سامنے اس ایٹم بم کی تصویر تھی جس نے اس تباہی کو جنم دیا تھا۔ اس کا قطر ۷۰ سنٹی میٹر لمبائی تین میٹر، وزن ۹ ہزار پاؤنڈ اور طاقت بیس ہزار TNT کے برابر تھی۔ یہ بم امریکہ کی ایک خفیہ بندرگاہ سے انڈیاناپولس نامی بحری جہاز میں لاد کر ۲۷ جولائی کو جزیرہ گوام پہنچایا گیا جو مشرقِ بعید کا جنگی مرکز تھا۔ سات دن پہلے گوام کی ہائی کمان کو یو ایس آرمی چیف آف سٹاف کی طرف سے حکم جاری کر دیا گیا تھا کہ تین اگست کے بعد جب بھی موسم اجازت دے جاپان کے چار اہم مراکز نیگاتا، ہیروشیما اور ناگاساکی یا



کوگورا میں سے کسی ایک پر پہلا ایٹم بم گرا دیا جائے۔ چنانچہ سازگار موسم کی بنا پر ہیروشیما کے نام قرعہ پڑا۔

دائیں طرف فرش پر شہر کا نقشہ بنا ہوا تھا اور عین اس مقام پر ایک سُرخ گولا لٹک رہا تھا جہاں بم پھٹا تھا۔ وہ مقام اس عجائب گھر سے صرف سوا سو میٹر دُور تھا۔ آگے بڑھے تو تباہ کاریوں کی تفصیل شروع ہو گئی۔ خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی اور ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہم اس وقت اُس ہیروشیما میں کھڑے ہیں اور اینولا۔ گے ہمارے سر پر موت کی طرح منڈلا رہا ہے۔

یہ بُت ایک باپ، ایک ماں اور ایک بچّے کے ہیں جن کے سروں کے بال ایٹمی دُھول سے اَٹے ہوئے ہیں۔ جسم کی جلد چیتھڑوں کی طرح جسموں پر جھُول رہی ہے۔ زبانیں باہر نکل آئی ہیں۔ ماں نے شیر خوار بچّے کی لاش چھاتی سے لگا رکھی ہے اور دوسرے بچّے کی انگلی پکڑے امان کی تلاش میں بھاگ رہی ہے۔ آنکھیں باہر اُبل رہی ہیں اور بے نور ہیں۔ اِرد گرد لاشیں ہی لاشیں، ملبہ ہی ملبہ اور آگ ہی آگ ہے —— ہم زیادہ سے زیادہ ۳۰ سیکنڈ وہاں ٹھہر سکے۔ بُت بنانے والے نے کس فنکاری سے چہروں کے کرب اور جسموں کی بے بسی کو اُجاگر کیا ہے اس کا اندازہ اسی سے لگائیے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سامنے وہ

اشتہارات آویزاں ہیں جو جنگ کے دنوں میں ہیروشیما پر گرائے گئے کہ:

"اے جاپان والو! جنگی جنون کو روکو ورنہ ہم اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

مگر کسی اشتہار میں ایٹمی حملہ کا ذکر نہیں ہے۔ ذرا آگے بڑھے تو درد اور بڑھ گیا کہ یہ ان معصوم بچوں کی یادگاریں ہیں جو اس حملہ کا شکار ہوئے۔ یہ پرائمری سکول کے بچے کی یونیفارم ہے جو جگہ جگہ سے جل گئی ہے۔ یہ کسی معصوم بچے کی گھڑی ہے جو عین سوا آٹھ بجے پر رک گئی ہے۔ اس کا خول پگھل چکا ہے۔ یہ کسی معصوم کا چھوٹا سا ٹفن بکس ہے جو حدت سے گچھا مچھا ہو گیا ہے۔ یہ ایک خوب صورت اور پھول سی بچی کا شناختی کارڈ ہے جو خدا جانے کیسے سلامت رہ گیا۔ تصویر میں اس کی آنکھیں اب بھی مسکرا رہی ہیں۔ بالوں میں ربن اب بھی لہرا رہا ہے۔ ہونٹوں پر تیرتی معصوم ہنسی ہے مگر اس شناختی کارڈ کے ساتھ اس کے جلے ہوئے کپڑے اور جوتے پڑے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس معصوم بچی نے کس کرب کے ساتھ جان دی ہو گی۔ مگر ہم نے سوچا کہ "اینولا۔ گے" کے سواروں نے اس معصوم بچی کو اٹھلاتے ہوئے بستہ بغل میں دبائے سکول کی طرف جاتے تو شاید دیکھا ہو گا —— یہ ایک اور معصوم کی یادگاریں ہیں۔ چھوٹا سا



پرس ادھ جلا، آپس میں گڈمڈ ہو کر یکجان ہو جانے والے کچھ سکّے اور سکول یونیفارم جلی پھنکی ہوئی۔

بائیں طرف عمارتوں کی حالتِ زار کا نقشہ۔ یہ لکڑی کا شہتیر ہے نرا کوئلہ، یہ لوہے کا گرڈر ہے خمیدہ، یہ چھت کی ٹائلیں ہیں جلی ہوئی، یہ دروازے کا کاٹھ ہے سوختہ، یہ بڑے گیٹ پر بنے ہوئے پتھر کے لمپ ہیں ٹوٹے پھوٹے اور دھوئیں سے کالے، یہ بڑے مندر کی فولادی گھنٹی ہے تپش سے سیاہ، یہ سومیتومو بنک کے زینے ہیں جن پر ایک انسان کا عکس چھپا ہوا ہے، یہ سپاہیوں کی باقیات ہیں، یہ عورتوں کا حصہ ہے جن کے جسم پر سیاہ پٹیاں چھپی ہوئی ہیں جس جس کپڑے پر سفید رنگ کے علاوہ کوئی اور رنگ تھا وہ رنگ جسموں پر چھاپ کی طرح لگ گئے ہیں۔ یہ شیشے کے برتن ہیں ایک دوسرے سے پیوستہ۔ یہ آہنی سیف ہے جو باہر سے صرف دھواں کھایا ہوا لگتا ہے مگر اس کے اندر پڑے ہوئے سکّے پگھل کر ایک دوسرے سے مل گئے ہیں اور نوٹوں کی گڈیوں میں سے صرف ایک آدھ درمیانی نوٹ جو سلامت رہا وہ بھی کناروں سے جلا ہوا ہے۔

یہ ہسپتال کی باقیات ہیں۔ پگھلے ہوئے جراحی اوزار، مڑی ہوئی بوتلیں، جلے ہوئے سٹریچر، ایک نرس کی سوختہ یونیفارم اور ڈاکٹر کا ادھ جلا نسخہ، گیلری میں ناگاساکی کے کچھ باقیات مُشتے از خروارے کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ ہم باہر نکلے تو حواس بجا نہیں تھے۔ اتنے میں ٹیلیویژن والوں نے غیر ملکی چہرہ

دیکھ کر گھیر لیا۔ خاتون پُوچھنے لگی :

"کیا آپ نے کبھی "NO MORE HIROSHIMAS" کا نعرہ
سُنا ہے ؟"

ہم نے کہا۔ "بی بی سُنا بھی تھا اور آج دیکھ بھی لیا ہے اور ہم یقیناً اِس نعرہ کے حق میں ہیں "

اور بے اختیار ہمارے مُنہ سے یہی نعرہ نکل گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں، آواز رندھ گئی۔ ہمارے ساتھی ڈاکٹر احمد دین نے جو شیشے کی سائنس کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں ہمیں حیرت سے دیکھا۔ ہم نے کہا :

"آپ شیشے کو پگھلانا اور ڈھالنا جانتے ہیں مگر دلوں کے
آبگینے آپ کے بس میں نہیں ہیں "

اِس عبرت سرا سے نکل کر چلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ قریب کے ریستوران میں جا بیٹھے اور کڑوی کسیلی کافی کے دو پیالے پینے کے بعد اِس قابل ہوئے کہ ذرا ہل جُل سکیں۔ واپس میوزیم آئے تاکہ جاپانی خاتون "شینوئی شودا" کی لکھی ہوئی تین لاکھ دُعاؤں کی زیارت کر سکیں جو اُس نے عمر بھر کی ریاضت سے صفحۂ قرطاس پر برش سے لکھیں اور اب اِس میوزیم میں رکھی ہوئی ہیں۔ جاپانی ہم پڑھ نہیں سکتے مگر ہر قوس پر موصوفہ نے اتنی محنت کی تھی کہ بے ساختہ اس کے خلوص کی داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ روایت یہ ہے کہ وہ مزید اٹھارہ ہزار



دعائیں لکھنا چاہتی تھیں مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اللہ اُس کی محنت قبول فرمائے!
واپسی کے لئے مُڑے تو ایک اَور مخطوطہ نے توجہ کھینچ لی۔ یہ بھی سادہ سی لکھی ہوئی عبارت تھی :

"یہ ہیروشیما کا انجام ہے!
آئیے! اِن رُوحوں کی آسودگی کے لئے دُعائیں کریں۔
سکون، اطمینان، مُکتی کی دُعائیں "

اِس میوزیم کے باہر ایک اشتہار لگا ہُوا تھا کہ :

"آج ۶؍ اگست سے ایک خاص دستاویزی فلم کی نمائش آڈیٹوریم میں شروع ہو رہی ہے۔ یہ فلم ۹؍ اگست ۱۹۴۵ء کو ایک جاپانی فوٹوگرافر نے تیار کی لیکن کچھ دن بعد ہی وہ تابکاری علالت کے باعث مر گیا۔ فلم قابض اتحادی فوجوں نے ضبط کر لی تھی مگر اب کچھ ضروری اضافوں کے ساتھ پہلی بار نمائش کے لئے پیش کی جا رہی ہے ــــ"

چنانچہ ہم کشاں کشاں آڈیٹوریم کی جانب چلے۔ اتنی بھیڑ تھی کہ اپنی باری کے لئے ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ قطار میں کھڑا ہونا پڑا۔ فلم کیا شروع ہوئی آنسوؤں، ہسکیوں اور آہوں کا طوفان آگیا۔

یہ ہیروشیما ہے۔ سکول کے ننھے ننھے بچے، چہکتے، چہلیں کرتے سکول

جارہے ہیں ۔ یہ بازار ہیں، لوگ باگ خریداری میں مصروف ہیں۔ یہ مہمان
طالب علم ہیں، جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ مخدوش عمارات کا ملبہ صاف
کرکرہے ہیں ۔ یہ ہیروشیما کاسل ہے ۔ گرینڈ، خوبصورت اور عظمتِ
رفتہ کا نشان ۔ یہ ہیروشیما کا مشہور باغ ہے، جس کے پھول دُنیا بھر میں
مشہور ہیں ۔ اور اس کے جدید ہسپتال ہیں جہاں ڈاکٹر اور نرسیں مریضوں
کی دیکھ بھال کر رہے ہیں ۔ یہ کارخانے ہیں جہاں دن رات کام ہوتا ہے ۔
یہ ٹرام سروس ہے جو مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہے ۔
یہ خوبصورت ندی ہے جو شہر کے بیچوں بیچ گزرتی ہے ۔ غرض زندگی ہی
زندگی ہے !!

مگر ۸ / اگست کو یہ شہر، شہرِ خموشاں ہے ۔ وہ بچّے کہاں ہیں ؟ وہ
پھول سے بچّے جن کی آنکھیں ستاروں سے زیادہ چمکیلی اور جن کے گال
چاند سے زیادہ روشن تھے ۔ وہ یہیں کہیں ہوں گے ، اِسی ملبہ میں ۔!
اِسی آگ میں !! وہ ہسپتال ، وہ بازار ، وہ کارخانے ، وہ لوگ ——
ہائے ۔ نگاہیں ڈھونڈتی ہیں مگر اِس شہر میں سوائے موت کی بے بسی کے
اور کچھ نہیں —— کہاں گئے وہ زمانے ، کہاں گئے وہ لوگ !! ویبقیٰ
وجه ربّك ذوالجلال والاکرام !

فلم کیا ہے ۔ عبرت ہی عبرت ہے ۔ اس کے بعد اس فلم کی ٹیلی ویژن



پر بھی نمائش ہوئی اور ہم نے ہر گھر سے سسکیوں کی آواز سُنی ! اور
اب بھی اس فلم کا حصّہ کہ جہاز کے اندر کیپٹن پارسن بم گرانے کے لئے
فیوز لگا رہے ہیں اور اُن کے ہاتھوں میں کوئی رعشہ نہیں ہے نگاہوں
کے سامنے پھر رہا ہے ۔ اے پارسن ! تم نے اپنے ہاتھوں موت کی
تخم ریزی کی ! کیا تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ تمہارا یہ کام کتنا مہلک ہوگا؟
تمہارے ہاتھ کیوں نہیں کانپے ؟ تمہارے ضمیر نے تمہیں کیوں نہیں
جھنجھوڑا ؟

آڈیٹوریم سے نکلے تو عجیب حالت تھی ۔ ساتھ کے کمرہ میں اُن
تصاویر کی نمائش ہو رہی تھی جو ہیروشیما کے ان بدنصیب لوگوں
نے بنائی تھیں جو سال دو سال تابکاری علالت بھوگنے کے لئے زندہ
رہ گئے تھے اور جن کی اولادوں میں سے اب بھی کچھ لوگ باقی ہیں مگر
مُردوں سے بدتر ۔ ان کے جسم نامعلوم امراض کا شکار اور ان کے ذہن
نامعلوم خوف کی آماجگاہ ہیں ۔ ہم نے ٹیلی ویژن پر ایک ہیروشیمائی
کا انٹرویو سُنا ۔ وہ اُس وقت پندرہ برس کا تھا اور اتفاق سے بم
گرنے کے وقت اپنے شہر سے دس کلومیٹر دُور تھا ، بظاہر توانا اور ڈانٹا
مگر اندرونی طور پر امراض کا ڈسا ہوا ۔ حکومت ان لوگوں کی ہر حال
میں پُرسانِ حال ہے ۔ وظائف دیتی ہے ۔ علاج کرواتی ہے ——

مگر دل کے زخموں کا علاج! کون کر سکتا ہے؟

دوسرے کمرے میں حکومت کے محکمۂ مردم شماری کے افسران رجسٹر کھولے بیٹھے تھے کہ آؤ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کے نام تلاش کرو تاکہ اُن کے نام اجتماعی یادگار پر کندہ کئے جا سکیں۔ اب تک تین لاکھ اٹھارہ ہزار نفوس میں سے صرف ۸۶،۱۳۴ نام رجسٹر ہو سکے ہیں باقی بدنصیبوں کا نام لکھانے والا بھی کوئی باقی نہیں۔

تیسرے کمرہ میں تصویری نمائش تھی کہ کون کون سے بڑے لوگ یہاں آئے اور ایٹم بم کی تباہ کاریوں کے خلاف تقریریں کیں اور عہد کیا کہ وہ ایٹمی پھیلاؤ کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہیں گے۔ اُن میں آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو بھی تھے۔ آپ خالص ہندوستانی لباس میں ملبوس کھڑے ہیں اور اعلان کر رہے ہیں کہ ہم ایٹمی اسلحہ کے خلاف ہمیشہ ڈٹ کر کھڑے رہیں گے۔ نیچے کسی منچلے نے مسز اندرا گاندھی کی تصویر کھینچ دی ہے جو گود میں ایٹم بم لئے کھڑی ہیں اور پتاجی کی آشیرباد کی منتظر ہیں۔

چوتھے کمرہ میں دُنیا کے اخبارات کے تراشے ہیں جن میں سے اکثر اس لئے پڑھنے کے قابل نہیں رہنے دیئے گئے کہ ان سے جاپان کی خارجہ پالیسی کے متاثر ہونے کا امکان ہے۔ نیوز کرانیکل کا تراشہ پڑھا



جا سکتا تھا وہ ہم اُوپر درج کر چکے ہیں۔

آڈیٹوریم سے نکل کر کھلے پارک میں آئے۔ اجتماعی قبر دیکھی۔ جس میں ہزاروں لاشیں اپنے عقیدہ کے برعکس زمین میں دفن کی گئی تھیں کیونکہ پہلے ہی جل چکی تھیں۔ بچوں کی یادگار دیکھی جو پھولوں سے لدی رہی تھیں۔ امن کی گھنٹی کے پاس گئے۔ لکھا تھا:

"اے آنے والو!
اِس گھنٹی کو زور سے بجاؤ
تاکہ امن کی آواز ہمیشہ تمہارے کانوں میں گونجتی رہے۔"

چنانچہ ہم نے اس گھنٹی کو بجایا اور واقعی اُس کی گونج ابھی تک کانوں میں بازگشت کر رہی ہے

امن کی آگ دیکھی جو ہمیشہ روشن رہتی ہے۔ سردی ہو یا گرمی، آندھی ہو یا برسات، کھلے میدان میں یہ آگ جلتی رہتی ہے اور اس کا عکس ملحق تالاب میں تیرتا رہتا ہے۔

امن کا گنبد دیکھا یعنی وہ ایک تنہا ڈھانچہ جو سلامت رہ گیا۔

غرض ہیروشیما کیا دیکھا انسانیت کے رِستے ہوئے زخم دیکھ لئے۔

وہ کتبہ اب بھی نگاہوں کے سامنے ایستادہ ہے جس پر بچوں کے شاعر "ساں کیچی توگے" کی مشہور نظم کندہ ہے:

"مجھے لَوٹا دو! میرا باپ اور میری ماں
مجھے لَوٹا دو! مرا دادا، مری دادی
مرا نانا اور مری نانی
مجھے لَوٹا دو! خود میرا وجود
مجھے انسانیّت کی تلاش ہے
مجھے امن، سکون اور آشتی کی جستجو ہے
ایسا امن جو پائیدار ہو اور اَمِٹ!
آؤ اور مجھے لَوٹا دو!